Shivaji University Kolhapur

شیواجی یونیورسٹی، کولہاپور

Humanities

B.A. PART III

بی۔اے۔سال سوم

Syllabus : URDU

Paper No.IX Semester -V

Paper Name :- Urdu Tanqid-o-Tahqiq

اُردو تنقید و تحقیق

Dr.Sabiha Sameeruddin Sayyad

Head of Department Urdu
Night College of Arts & Commerce.Ichalkaranji
Dist.Kolhapur Maharashtra

مصنفہ:۔ڈاکٹر صبیحہ سمیر الدین سیّد

(صدر شعبہ اُردو)

نائٹ کالج آف آرٹس اینڈ کامرس، اچلکرنجی، ضلع کولہاپور

Topic for Study :

Unit 1. Tanqid ki tariff ahamiyat aur ifadiyyat,Aghaz-o-Maqasid,

Naqqad ke Farayiz, Adabi Tanqid ke Usool.

Unit 2. Urdu mein Tanqid ka aaghaz-o-irtiqa.

i) Urdu Tanqid ke Qadem Namune

ii) Tazkire,Takrizen,Mushairey,Asateza islahan.

Unit 3. Riyayati Naqqad.

i) Maulana Hali ii) Shibli Numani iii) Mohd.Hussain Azad

Unit 4. Tanqid ke Dabistane

i) Ta'assirati ii) Jamaliyati iii) Marzi iv) Taraqqi Pasand

i) Nafsiyati vi) Scientific vii) Tanabuli

SHIVAJI UNIVERSITY, KOLHAPUR

(B.A. Part-III Urdu- Paper-IX.&XIV)

P.no – IX.. DSE-E33 Urdu Tanqid & Tahqeeq

P. no – XIV DSE-E158

Author's/Editor's name:

Dr. Sayyad SabihaSameeroddin
Dr.Bilquis Begum

Published by:

Dr. V. N. Shinde
Registrar
Shivaji University, Kolhapur-416 004

Printer's Details:

Shri. B. P. Patil
Superintendent
Shivaji University Press, Kolhapur-416 004

Edition-1st

ISBN:978-93-92887-71-0

CENTRE FOR DISTANCE EDUCATION

SHIVAJI UNIVERSITY, KOLHAPUR

Copyright ©Registrar, Shivaji University, Kolhapur. (Maharashtra)

اُردو تنقید و تحقیق

اردو میں تنقید

روایتی نقاد

تنقید کے دبستان

Uniit-1

اکائی ۱
اُردو تنقید و تحقیق

اکائی ۱ :

اکائی کے اجزاء

۱۔۱ : مقصد

۱۔۲ : تمہید

۱۔۳ : تنقید کی تعریف

۱۔۴ : تنقید کی اہمیت وافادیت

۱۔۵ : تنقید کے اغراض ومقاصد

۱۔۶ : خود جانچنے کے سوالات

۱۔۷ : اس اکائی کے اہم سوالات

۱۔۸ : فرہنگ

۱۔۹ : سفارش کردہ کتابیں

۱۔۱ : مقصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلباء سے اُمید کی جاتی ہے۔تنقید کا مفہوم ومعنی پرکھنا یا اصلاح کرنے کے ہوتے ہیں۔تنقید ہماری زندگی کے لئے اتنی ضروری ہے جتنی کہ سائنس:

۱۔۲ : تمہید

تنقید کے معنی مفہوم اور زندگی کے لئے جتنی سانس مفید ہوتی ہے اتنی ہی غرض انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے طلباء اسے سمجھ سکیں۔

۳۔۱ : تنقید کی تعریف

تنقید یہ لفظ انگریزی اصطلاح (criticism) کا مترادف ہے جس کے لغوی معنی نقطہ چینی اور حرف گری کے ہیں اور اس کا اصلی معنی عدل وانصاف کے ہیں۔ کسی چیز کو دیکھ کر اس کی اچھائیوں اور برائیوں کا صحیح اندازہ لگانا اور اس پر کوئی رائے قائم کرنا تنقید کہلاتا ہے۔ تنقید کے متعلق میتھیو آرنلڈ نے کہا ہے کہ دنیا میں جو بہترین باتیں معلوم کی گئی ہیں یا سوچی گئی ہیں انہیں غیر جانبدارانہ طور پر جاننے اور عام کرنے کی خواہش کا نام تنقید ہے۔ تنقید کے متعلق آل احمد سرور کا کہنا ہے کہ تنقید وضاحت ہے تجزیہ ہے، تنقید قدریں متعین کرتی ہے زندگی کو ایک پیمانہ دیتی ہے۔ تنقید انصاف کرتی ہے جھوٹ، سچ، اعلیٰ پست، بلند کے معیار قائم کرتی ہے۔

۴۔۱ : تنقید کی اہمیت وافادیت

نامور نقاد ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (T.S,Eliot) نے کہا کہ تنقید ہماری زندگی کے لئے اتنی ہی ناگزیر ہے جتنی زندگی کے لئے سانس۔ ادب ایک بہت ہی پیچیدہ اور پُر اسرار فن ہے اور اس کے موضوعات بھی بے کراں ہیں۔ ادیب خیال کو قلمبند کرنے سے پہلے سوچتا ہے۔ اور سلسلہ اپنے فکر کی ایک تصویر بناتا ہے۔ ادب کا وصف یہ ہے کہ وہ تخیل کے سانچے میں ڈھل کر ظاہر ہوتا ہے ادب ان تحریروں کو کہتے ہیں جن کا اسلوبِ فن کالالہ حسن کامل ہو فن کار کی نظر عام انسانوں کی نظر کے مقابلے میں زیادہ تر تیز اور دور رس ہوتی ہے اور وہ حسن کا سراغ لگاتے ہوئے ایسی دریافت میں کھو جاتا ہے جہاں معمولی انسان کا رگزر ممکن ہی نہیں لیکن ادیب کسی خیالی دنیا میں نہیں رہتا جس معاشرے میں زندگی سر کرتا ہے اس کے حقائق اور کوائف کیفیت سے اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ ایسا کرے گا تو اس کی تخلیقات کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔ ادیب کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ ایسا کرے گا تو اس کی تخلیقات کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔ ادیب کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنے گرد وپیش کو اپنے ماحول کو اور معاشرے کو تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ادب کی تخلیق کرے ادب کے موضوعات جتنی انسانی زندگی سے قریب تر ہوں گے اتنے ہی انسان کے لئے زیادہ اہم ہوں گے اور ایسی ہی ادبی تخلیقات میں رفعت وعظمت پیدا ہوگی۔

ادب تنقید کا موضوع ہے زندگی اور اس کے بے کراں وسعت ادب کا موضوع ہے۔ اس طرح کا تنقید کا تعلق بالواسطہ طور پر زندگی سے بھی ہے۔ انسانی زندگی اور ادب سے متعلق جتنے افکار اور نظریات ہو سکتے ہیں تنقید انہیں سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ ایک نہ جھٹلا دینے والی حقیقت ہے کہ بڑے تخلیقی کارنامے کسی اپنے تنقیدی شعور کے بغیر وجود میں نہیں آسکتے۔ تخلیقی صفت تنقیدی شعور کے بغیر

گمراہ ہوجاتی ہےاورتنقیدی شعور بغیر تخلیقی لیاقت کے بے جان رہتا ہے صحت مند تنقید تخلیقی ادب کی طرف مائل کرتی ہے چونکہ یہ صحت مند تنقید خود تخلیق ہوتی ہے اس لئے پڑھنے والوں کے ذہن پر مہر نہیں لگاتی۔ بلکہ اس کے ذہن کی تربیت کرتی ہے۔تخلیقی ادب میں تنقیدی شعور کی کارفرمائی ہوتی ہے۔تنقید کی واضح خصوصیت ایک خاص قسم کا ذہنی توازن اور اعتدال ہے۔نقاد اگر ذوق سلیم رکھتا ہوتو کھرے کھوٹے کی تمیز کرلیتا ہے۔بقول احتشام حسین تنقید اقسام وفہم،ترتیب،اور ذوق اور ادراک وحقیقت کا ایک ذریعہ ہے۔تنقید ایک انتہائی سنجیدہ انداز نظر اور طرز اظہار کا مطالعہ کرتی ہے۔آل احمد سرور نے تنقید کی اہمیت اس طرح بیان کی ہے''تنقید ادیبوں، قاری اور خود ادب کے لئے مشعل ہدایت ہے۔''

تنقید ذہن کو روشن کرتی ہے اور یہ روشنی اتنی ضروری ہے کہ بعض اوقات اس کی عدم موجودگی میں تخلیقی جوہر کسی شئے کی کمی محسوس ہوتی ہے نقاد اپنی دنیا کا کولمبس ہوتا ہے۔جو وہ پڑھنے والے کو ایک نئی فضا میں لے جاتا ہے جس کا حسن اس لئے دریافت کیا ہے۔ہر تنقید ایک ذہنی سفر کا آغاز ہے اچھی تنقید میں جذبے کو ایک پختہ اور مہذب احساس کا نکھار مل جاتا ہے۔غرض تنقید جوہر کے لئے معاون ہے اور زندگی کو بہتر طریقے سے سمجھنے میں مدد بھی کرتی ہے۔

تنقید کی اہمیت سے متعلق ٹی۔ایس۔ایلیٹ کا کہنا ہے کہ تنقید کی قدر و قیمت کا ارتقاء دراصل زندگی کی قدر و قیمت کا انکار ہے تنقید تو ایک صحیح تربیت پائے ہوئے شائستہ وہ مہذب دماغ کا عمومی جوہر وصف بھی ہے اور اس کی بے انتہا متنوع رنگا رنگ خصوصی شکلیں بھی ہوتی ہیں۔

تنقید کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی کہتے ہیں کہ تنقید بذات خود بھی اہم ہے اس کی خود اپنی ایک تخلیقی حیثیت یہ خود ایک فن ہے اور فن جس طرح اہمیت کے حامل ہوتے ہیں تنقید بھی اہمیت رکھتی ہے۔ادب کی طرح انداز بیان اور طرز ادا کے ذریعے تنقید کو بھی زیادہ دلچسپ بنایا جاسکتا ہے اور اس میں بھی جمالیاتی خوبیاں پیدا کی جاسکتی ہیں اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں بہرحال یہ بھی ادب ہے۔

۵۔۱ : تنقید کے اغراض ومقاصد

کسی چیز یا ادب وفن کو جانچنے پرکھنے اور اس کے متعلق تحقیق کرنے کے لئے تنقید بے حد ضروری ہے۔تنقید کے بغیر صحیح قسم کا ادب وجود میں نہیں آسکتا اگر تنقید نہ ہوتو ادب کا وجود بھی باقی نہ رہے گا۔تنقید کا بڑا کام یہ بھی ہے کہ ادبی فنی فضا پیدا کرکے عوام کے ذوق میں نکھار پیدا کرے۔تنقید کا مقصد صحیح اور غلط اچھے اور بُرے کی تمیز پیدا کرنا، برائیوں کی مذمت کرنا اور اچھائیوں کی صحیح ترجمانی کرکے اس کو فروغ دینا ہے۔

فن پارے پر جو تنقیدیں لکھی جا چکی ہیں اس کی تعریف کرنا بھی نقاد کا کام ہوتا ہے تا کہ اس کے ذریعے اپنی رائے سے اس کا موازنہ کر سکے جانچ اور پرکھ کے پورے عمل میں تنقید کی اصلاح کا پہلو نمایاں رکھنا چاہیے معاشرے کی آئندہ ضرورتوں کے پیش نظر فنکاروں کے لئے راہ متعین کرنا بھی تنقید کا مقصد ہے تا کہ آئندہ نسل کو بھٹکنے کی ضرورت نہ پڑے۔ تنقید کا مقصد دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا ہے۔ بقول ڈاکٹر رچرڈسن کے لئے جو کام ڈاکٹر ایک انسانی جسم کے لئے کرتا ہے وہی کام تنقید ادب کے لئے کرتی ہے اور ذہنی صحت کا معیار قائم کرتی ہے۔

موجودہ زمانے میں فن کے تین مقاصد ہیں یا تخلیق کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کے تین اغراض ہیں۔ (۱) تشریح یا تعارف (۲) حکم یا فیصلہ (۳) ترتیب

(۱) تشریح یا تعارف : تشریح یا تعارف کے سلسلے میں درج ذیل نکات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے نقاد کے لئے ضروری ہے کہ جس موضوع کے متعلق وہ تفصیلی کتاب پڑھ رہا ہے اس سے تعلق رکھنے والی دیگر تصانیف کا بھی مطالعہ کریں غور و فکر اور عمیق مطالعے کی روشنی میں خلوص کے ساتھ زیر نظر تصنیف کی خوبیوں اور خامیوں کو پرکھے اور اس کا درجہ متعین کرے تصنیف کا جائزہ لیتے وقت یہ بھی دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ تصنیف یا تخلیق موضوع سے مطابقت رکھتی ہے یا نہیں عصر حاضر سے اس کا کیا تعلق ہے۔ تصنیف کو صنف اور اس کے ماحول سے کیا نسبت ہے۔ مصنفین کے سوانحی حالات پر روشنی ڈالنی چاہیے اس کے وطن کے جغرافیائی، سماجی، سیاسی، تاریخی اور نفسیاتی حالات پر بھی روشنی ڈالنی چاہیے یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ کن افکار اور خیالات سے متاثر ہوا اس نے محض تقلید کی ہے کچھ اضافہ کیا ہے، یا جدت پیدا کی ہے۔

(۲) حکم یا فیصلہ : حکم یا فیصلہ صادر کرنے کیلئے نقاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے فطری میلان، ذاتی رجحان، پسند ناپسند کے جذبے سے اجتناب کرے عام طور پر نقاد تنقید کرتے وقت چند خامیوں اور خوبیوں کو منتخب کر لیتے ہیں اور اپنے اصول تنقید کی روشنی میں تصنیف کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں لیکن ایک صالح ادب کی تخلیق کے لئے اس طرح کے غیر منصفانہ رویے کو ترک کرنا چاہیے اگر کسی کو مرثیہ کا رزم و بزم پسند آتا ہے تو اس کا یہ مفہوم نہیں کہ وہ غالبؔ کی غزل کی مذمت کرے اگر داستان پسند ہے تو ناول اور افسانے کی خامیاں بیان نہ کریں۔

(۳) ترتیب : ترتیب کا نمبر تشریح اور حکم کے بعد آتا ہے۔ اگر نقاد غالبؔ کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ کر رہا ہو تو اسے چاہیے کہ شعرائے متقدمین، شعرائے متوسطین اور دکنی شعراء کے کلام کا غائر غور پر مطالعہ کرے اور یہ دیکھے کے غالبؔ کے عہد تک آتے آتے اُردو غزل کن مراحل سے گزری اور اس میں فطری اور فنی اعتبار سے کی گئی تبدیلیاں آئی ساتھ ہی ساتھ معاصرین شعراء کے کلام کا بھی

گہرائی سے مطالعہ کریں تا کہ غالبؔ کا درجہ اوران کی انفرادیت کومتعین کیا جا سکے۔

مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تنقید کا مقصد ایسے اصولوں کو مرتب کرنا ہوتا ہے جن کی مدد سے تخلیقات کے فنی محاسن کی دریافت اوران کی قدر و قیمت کا تعین کیا جا سکے۔تنقید کے ذریعے فنکار کے ذہنی ارتقاء کا پتہ لگا کے اس کے فن پارے کی خوبیوں اور خامیوں کا تجزیہ کیا جس کے فنکار کی زندگی کے نشیب وفراز اس کے ماحول جس میں اس نے پرورش پائی اوراس کی تخلیقی صلاحیتوں کا جائزہ لے کراس کی تخلیقوں کا تجزیہ کرے اوراس کے روشن پہلوؤں پر نہایت ایمانداری سے روشنی ڈالیں۔

۱۔۶ : خود جانچنے کے سوالات

۱) تنقید کی تعریف بیان کیجئے۔

۲) تنقید کی اہمیت پیش کیجئے۔

۳) تنقید کے فوائد یا افادیت پر روشنی ڈالیے۔

۱۔۷ : اس اکائی کے اہم سوالات

۱) اُردو تنقید کی اہمیت وافادیت پر مفصل روشنی ڈالیے۔

۲) تنقید کے آغاز وارتقاء کا اجمالی جائزہ لیجئے۔

۳) تنقید کے فوائد یا افادیت پر روشنی ڈالیے۔

۱۔۸ : فرہنگ

۱) الفاظ	معنی
تنقید	پرکھنا/جانچنا
ارتقائی	ترقی
تحقیق	تلاش/کھوج
افادیت	فائدہ
تخلیق	پیدا کرنا

۹۔۱ : سفارش کردہ کتب

۱) اُردو تنقید پر ایک نظر -- کلیم الدین احمد

۲) اُردو تنقید کی تاریخ -- مسیح الزماں

Unit-2

اکائی ۲

اکائی نمبر ۲ :

اکائی کے اجزاء

۱۱۔اَ۔۔۲: مقصد

۲ : تمہید

۱۳ : اُردو میں تنقید کا آغاز وارتقاء

۱۴۔ : خود جانچنے کے سوالات

۱۵۔ : اس اکائی کے اہم سوالات

۱۶۔ : فرہنگ

۱۷۔ : سفارش کردہ کتب

۱۱۔ : مقصد

طلباء کو اُردو تنقید سے روشناس کرانا اور ہسیت سے واقفیت حاصل ہونا۔

۱۲۔ : تمہید

طلباء تنقید کا مفہوم۔تعریف، اہمیت وافادیت کو سمجھ سکیں۔

۱۳۔۲ : اُردو میں تنقید کا آغاز وارتقاء:

ایک عام خیال یہ تھا اور بعض حلقوں میں آج بھی موجود ہے کہ اُردو تنقید کا کوئی مسلسل ارتقاء نہیں، بعض لوگ تو سرے سے اس کے وجود ہی کے منکر ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ اُردو میں تنقید کا ایک مستقل اور مسلسل ارتقاء ملتا ہے۔ یہ تنقید ہے کہ اس میں مغرب کے تنقیدی ارتقاء کی سی وسعت اور فکر کی گہرائی نظر نہیں آتی اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو ادب کی عمر ابھی ڈھائی تین سو سال سے زیادہ نہیں۔ اور اُردو نثر کی عمر تو اس سے بھی کم ہے۔ ڈھائی تین سو سال میں جو ترقی ایک صنف ادب یا شعبہ ادب کے لئے ممکن ہو سکتی ہے وہ اُردو تنقید نے بھی کی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُردو کے تنقیدی نظریات میں فکر کی گہرائی بہت کم ملتی ہے لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ یہاں فلسفیوں نے ان بحثوں کو نہیں چھیڑا بلکہ زیادہ تر ادیبوں اور شاعروں نے یہ بحثیں کی ہیں۔ پھر بھی ان میں سے مختلف اوقات میں اکثر نے فکر کی گہرائی اور اوپج کے ایسے نمونے پیش کئے ہیں جن کی وجہ سے اُردو کو خاصہ بلند مرتبہ حاصل ہو گیا ہے۔

ان اوراق میں اُردو کے تنقیدی ارتقاء کو تخلیقی و تنقیدی زاویہ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ اُردو تنقید کے ارتقاء کو حالات و واقعات اور فضا و ماحول کی پیداوار ثابت کیا جائے۔ کیونکہ نہ صرف تنقید بلکہ ادب کا ہر شعر بہ حالات و واقعات ہی کے سانچے میں ڈھلتا ہے اور حالات و واقعات کو اپنے سانچے ڈھالتا ہے، اُردو تنقید کو بھی حالات و واقعات ہی نے پیدا کیا۔ بدلتے ہوئے حالات و واقعات کی تبدیلیوں سے ہم آہنگ رہا ہے اور آئندہ بھی اسی طرح ہم آہنگ رہے گا۔

اُردو تنقید کے ارتقاء کو پیش کرتے ہوئے سب سے پہلے اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ مختلف تنقیدی نظریات اور مختلف تنقیدی معیار جو مختلف اوقات میں قائم ہوتے رہے، ان کا تذکرہ کیا جائے۔ پھر اس کے بعد ان نظریات کی روشنی میں جو تنقید ہوئی اس کا جائزہ لیا جائے اور جن لوگوں نے اصول تنقید کی بحث نہیں کی، جن کے یہاں نظریاتی تنقید کا پتہ نہیں چلتا، ان کی مختلف تنقیدی تحریروں سے ان نظریاتِ تنقید کو معلوم کرنے کی کوشش کی جائے ..... گویا نظری اور عملی دونوں طرح کی تنقیدوں کے ارتقاء کا جائزہ ہے جس میں تاریخی ترتیب خاص طور پر پیش نظر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ اس مقالے کو اُردو تنقید کی مکمل تنقیدی تاریخ بھی کہہ سکتے ہیں، اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس میں کسی نقاد، کسی نظریہ، تنقید اور کسی انداز تنقید کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

تنقیدی زاویہ نظر سے اس میں جگہ جگہ کام لیا گیا ہے اس خیال کے پیش نظر کہ کہیں یہ تالیف اُردو تنقید نگاروں یا نظریات تنقیدی کا محض ایک تذکرہ ہو کر نہ رہ جائے۔ لیکن یہ تنقید مختلف رجحانات پر زیادہ ہے، رجحانات کے علمبرداروں پر کم ہے۔ کیونکہ اگر ایک ہی رجحان کے مختلف علمبرداروں پر جگہ جگہ مفصل تنقید کی جاتی تو اس میں خیالات کے دہرائے جانے کا اندیشہ تھا۔ پھر بھی ان رجحانات کے علمبرداروں میں سے کسی کی تنقید میں اگر کوئی ایسی بات ملتی ہے جس پر بحث کا دروازہ کھل سکتا ہے تو اس سے چشم پوشی نہیں کی گئی ہے

ایسے تنقیدی مباحث ان اوراق میں جا بجا نظر آئیں گے۔

ہر تنقید نگار کے پیش نظر ایک نقطہ نظر کا ہونا ضروری ہے۔ یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ اچھی تنقید کے بغیر اس کے ممکن نہیں۔ چنانچہ ان اوراق میں جہاں تنقیدی نقطہ نظر کی وضاحت میں انتہا پسندی کہیں بھی نظر نہیں آئے گی۔ اس نقطہ نظر سے بہتوں کو اختلاف ہوسکتا ہے لیکن ادب اور تنقید میں نقطہ نظر کے بنیادی اختلافات اس قدر عام ہیں کہ ان سے کوئی شخص دامن نہیں بچا سکتا۔

یہ موضوع بہت وسیع تھا، اسی خیال کے پیش نظر اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مواد کم ابواب میں سمو دیا جائے تا کہ پڑھنے والوں پر بار نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقالے کے اکثر ابواب خاصے طویل ہو گئے ہیں۔ حالانکہ ان ابواب کی ذیلی سرخیوں ہی پر مختلف ابواب لکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس طرح اس کا حجم اور بھی بڑھ جاتا۔ ذیلی سرخیوں کے تحت خیالات کو پیش کرنے میں جس اختصار سے کام لیا جاتا ہے وہ ابواب میں ممکن نہیں۔

اس موضوع کو نو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب تمہیدی ہے جس میں فن تنقید پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اس بحث میں فن تنقید سے متعلق ہر پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اُردو میں اس موضوع پر مواد کی کمی ہے، اسی خیال نے اس باب کی غیر معمولی طوالت کو بھی گوارہ کر لینے پر مجبور کر دیا۔ دوسرے باب میں اُردو کی قدیم روایات تنقید کی بھی تفصیل ہے۔ یہ روایات ہمیشہ سے موجود تھیں ان کو مخصوص حالات سے پیدا کیا تھا۔ زیادہ جاندار نہ ہونے کے باب میں اُردو کی قدیم روایات تنقید کی بھی تفصیل ہے۔ یہ روایات ہمیشہ سے موجود تھیں ان کو مخصوص حالات سے پیدا کیا تھا۔ زیادہ جاندار نہ ہونے کے باوجود ان روایات کے اثرات آج تک اُردو تنقید میں نظر آتے ہیں۔ تیسرے باب میں غدر کے بعد کے نئے خیالات اور نئے حالات کے زیر اثر جو تنقید شروع ہوئی اس کا ذکر ہے۔۔۔ یہ صحیح معنوں میں اُردو تنقید کی ابتداء تھی۔ اور چونہ اس دور کے تنقید نگاروں نے خاص طور پر تنقید کی طرف انہاک ظاہر کیا۔ اور اصول تنقید پر خصوصیت کے ساتھ توجہ کی۔ اس لئے ان کی تنقید نگاری پر تفصیل کے ساتھ علیحدہ علیحدہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ چوتھے باب میں نقادوں کی ان تنقیدوں کا بیان ہے جو براہ راست یا بالواسطہ عہد تغیر کے نقادوں سے متاثر سمجھے لیکن ان میں سے ان محققین کو علیحدہ کر لیا گیا ہے جن میں سے اکثر پر عہد تغیر کی تنقید کا اثر پڑا ہے اور ان کا ذکر تحقیق و تنقید کے عنوان سے پانچویں باب میں کر دیا گیا ہے۔ چھٹے اور ساتویں باب میں اُردو تنقید پر پڑتے ہوئے مغرب کے تمام اثرات کی وضاحت کی گئی ہے۔ ایک باب میں تقسیم کر دینا مناسب سمجھا گیا۔ ان دونوں ابواب میں ان افراد کی تنقیدوں کا ذکر ہے جو مغرب کے زیر اثر تنقدیں لکھتے رہے اور ساتھ ہی ان رجحانات کا بیان بھی ضروری ہے۔ جو مغرب کے زیر اثر اُردو میں آئے آٹھویں باب میں تنقید کے جدید رجحانات اور ان کی کش مکش پر بحث کی گئی ہے اور نواں باب ادبی تاریخوں اور رسالوں کی تنقید سے متعلق ہے، آخر میں ماحصل کے عنوان سے بھی چند صفحات

لکھے گئے ہیں تاکہ اختصار کے ساتھ اُردو تنقید کی خصوصیات اور اس کے ارتقاء کی مسلسل تاریخ کا صحیح انداز ہو جائے اور اس حقیقت کا پتہ بھی چل جائے کہ اس کی رفتار ہمیشہ حالات وواقعات سے ہم آہنگ رہی ہے۔

راقم الحروف نے حتی الامکان اس بات کی کوشش کی ہے کہ اُردو تنقید سے متعلق کوئی اہم بات چھوٹ نہ جائے البتہ بعض ایسے لکھنے والوں کی تنقیدوں کو اس میں شامل نہیں کیا گیا ہے جن کی بنیادیں نفرت اور بغض وعناد پر قائم ہیں جو مضحکہ اڑانے اور پھبتیاں کسنے کو تنقید سمجھتے ہیں۔ مثلاً اس میں معرکہ شرر وچکبستؔ اور اودھ پنچ کی دل آزادانہ تنقیدوں کا ذکر نہیں ملے گا، کیونکہ اس سلسلہ کی تمام تنقیدوں کا شمار تحقیق کے تحت ہونا چاہیے اور ظاہر ہے کہ تحقیق کی کوئی تنقیدی اہمیت ہو نہیں سکتی۔ تخلیق کا یہ سلسلہ آج بھی ختم نہیں ہوا ہے کیونکہ کبھی کبھی اخبارات ورسائل میں ایسی تنقیدی کاوشیں آج بھی نظر آجاتی ہیں جن سے ان دل آزادانہ تنقیدوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے لیکن ان سے بھی یہاں بحث نہیں کی گئی، اس کے علاوہ بعض ایسے نقادوں پر بھی کم لکھا گیا ہے جن میں یہاں شعوری کمی ہے اور جنہوں نے ذاتی غور وفکر سے کم کام لیا ہے۔

مجھے اس موضوع پر مواد کی فراہمی کے سلسلے میں خاصی دقتیں اٹھانی پڑیں، خصوصاً پرانے رسائل کی تلاش میں، دیکھ بھال اور چھان بین نے بہت وقت لیا۔ لیکن رسائل کے پرانے فائلوں کی چھان بین ضروری تھی، کیونکہ اُردو تنقید سے متعلق زیادہ اسرار پرانے رسالوں ہی کے سینے میں محفوظ ہے لیکن بزرگوں، دوستوں اور شاگردوں کی مدد نے یہ اور اسی طرح کی بہت سی مشکلوں کو آسان کر دیا۔ میں اس سلسلہ میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب قبلہ سید مسعود حسین صاحب رضوی ادیب، پروفیسر حامد حسن قادری، پنڈت برجموہن، دتاتریہ کیفی، پروفیسر سیّد احتشام حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم، سیّد سجاد ظہیر، پروفیسر آل احمد سرورؔ اور پروفیسر عزیز احمد کا ممنون ہوں۔ ان بزرگوں اور دوستوں نے نہ صرف فراہمی مواد میں میری مدد کی، بلکہ اکثر وبیشتر میں اس موضوع پر ان سے مشورے طلب کرتا رہا اور وہ اپنے مفید مشوروں سے مجھے سرفراز فرماتے رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی مدد اگر شامل حال نہ ہوتی تو یہ کام اس صورت میں کبھی بھی مکمل نہ ہوگا۔ مشرقی تنقید کے متعلق مجھے پروفیسر مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور ڈاکٹر خورشید احمد فاروقی سے بڑی مدد ملی۔ میں ان حضرات کا بھی شکر گذار ہوں۔

یہ کام میں نے لکھنو یونیورسٹی کی پی۔ ایچ۔ ڈی ڈگری کے لئے ۱۹۴۲ء میں شروع کیا تھا۔ چار سال کام کرنے کے بعد میں نے اسے یونیورسٹی میں پیش کیا۔ سال بھر یونیورسٹی نے لے آیا۔ پھر ملک میں تقسیم کے بعد ایسے حالات رونما ہوئے کہ ایک کو دوسرے کی خبر ہی نہ رہی۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہر فرد خود اپنے آپ سے بے خبر ہو گیا۔ اس لئے اس کی اشاعت میں کئی سال کی تاخیر ہو گئی۔ ورنہ اب تک یہ کبھی کی چھپ کر شائع ہو گئی ہوتی۔

۲۔۱۴: خود جانچنے کے سوالات

۱) اُردو میں تنقید نگاری

۲) تنقید کے آغاز وارتقاء پر روشنی ڈالیے۔

۲۔۱۵ : فرہنگ :

الفاظ	---	معنی
تالیف	---	ترتیب کردہ کتاب
طوالت	---	طبائی/دراز
معیار	---	درجہ
تنقید	---	پرکھنا/جانچنا

۲۔۱۶ : سفارش کردہ کتابیں :

تنقیدی اشارے	---	آل احمد سرور
تنقید کیا ہے؟	---	آل احمد سرور
تنقیدی حاشیے	---	مجنوں گورکھپوری
اُردو میں کلاسیکی تنقید	---	

اکائی ۲:

اکائی کے اجزاء

۲۔۱۸ : مقصد

۲۔۱۹ : تمہید

۲۔۲۰ : اُردو تنقید کے قدیم نمونے

۲۔۲۱ : تذکرے، تقریظیں، مشاعرے، اساتذہ کی اصلاح

۲۔۲۲ : خود جانچنے کے سوالات

۲۔۲۳ : اس اکائی کے اہم سوالات

۲۔۲۴ : فرہنگ

۲۔۲۵ : سفارش کردہ کتابیں

۲۔۱۸ : مقصد

اس اکائی سے طلباء اور تنقید کے قدیم نمونے تذکرے، تقریظیں، مشاعرے اور اساتذہ کی اصلاح سے روشناس کرانا ہے۔

۲۔۱۹ : تمہید

اُردو تنقید کے آغاز وارتقاء کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ تنقید کی اہمیت وافادیت اور تنقید کے قدیم نمونے سے واقفیت کرانا ہے۔

۲۰۔۲ : اُردو تنقید کے قدیم نمونے

فارسی ادب میں تنقید کا کوئی خاص ارتقاء نظر نہیں آتا۔ عربی ادب سے فارسی نے اپنا لیا ہے اور چند روایا تقائم کر لیں اس میں خاص طور پر تخیل اور غور و فکر کا مطلق دخل نہیں تھا۔ فارسی کی تنقیدی روایات بالکل میکانکی تھیں چند خاص کلمے، جملے اور خیالات تھے جس کو تنقید سمجھا جاتا تھا۔

اُردو کی ابتدائی تنقید کا رنگ یہی ہے جو فارسی کی طرح ایک خاص سماجی نظام کی پیداوار ہے۔ جس میں جمود، ٹھہراؤ یہ نہ پھیلنے والے اور بڑھنے والی کیفیت تھی۔ جو فارسی کی تنقیدی روایت پر مشتمل ہے۔ چند فقروں اور الفاظ تک محدود ہے۔ معنی و بیان کی چند اصطلاحات اس کا سرمایہ ہیں۔ وہ تنقید کی ابتدائی روایات ہونے کی وجہ سے اُردو کے تنقید ارتقاء میں اہمیت رکھتی ہیں ان سے زمانے کے تنقیدی شعور کا انداز ہوتا ہے جو تذکرے، تقریظیں، مشاعرے، اساتذہ کی اصلاحیں پر مشتمل ہیں۔

تنقید شعور کے بغیر ادب کا تصور ممکن نہیں۔ یوں سمجھئے کہ ادب کے ساتھ ہی ادبی تنقید کا آغاز ہو جاتا ہے۔ تخلیقی عملی میں تنقیدی صلاحیت کارفرما رہتی ہے۔ یعنی جو کوئی ادبی یا شاعر کسی فن پارے کی تخلیق میں مشغول ہوتا ہے تو تنقیدی شعور اس کی رہنمائی کرتا رہتا ہے۔ کسی تخلیق کا مطالعہ کرتے وقت ہم اس بات سے اکثر بے خبر ہوتے ہیں کہ فن کار نے اسے آخری شکل دینے تک کتنی محنت کی ہے۔ ایک ایک لفظ کو کتنی بار بدلا ہے، الفاظ کی ترتیب میں کتنی دفعہ ردو بدل کیا ہے اور ہم تک پہنچنے سے پہلے ایک ایک سطر کیسی کیسی تبدیلیوں سے دوچار ہوئی ہے۔ فن کار کی اس محنت کو تنقیدی محنت کہا جاتا ہے۔ جس فن پارے پر یہ محنت جتنی زیادہ ہوئی ہوگی وہ اتنا ہی زیادہ دل نشیں، پُر اثر اور کامیاب ہوگا۔ مقدمہ شعر و شاعری میں حالؔی نے لکھا ہے کہ رومی شاعر ورجل کا معمول تھا کہ صبح کو شعر کہنا اور دن بھر ان کی نوک پلک سنوارتا اس کا خیال تھا کہ :

> ''جس طرح ریچھنی اپنے بچوں کو چاٹ چاٹ کر خوبصورت بناتی ہے اسی طرح شاعر بار بار
> بدل کر کے اپنے شعروں کو سنوارتا اور بہتر بناتا ہے۔''

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا کہنا ہے کہ:

''بعض لکھنے والوں کی تخلیق دوسروں سے اس لیے بہتر ہوتی ہے کہ ان کا تنقیدی شعور زیادہ ترقی یافتہ ہوتا ہے''

کوئی تخلیق جب مکمل ہو کے دوسروں تک پہنچتی ہے تو وہاں تنقید کا اظہار ان کی پسند یا ناپسند کی شکل میں ہوتا ہے۔ مشاعروں کی اہمیت ہے اور دُنیائے تذکرہ نگار نے اختصار ملحوظ خاطر رکھا ہے کی داد یا نکتہ چینی بھی تنقید ہی ہے جو ضبطِ تحریر میں نہیں آتی اور وقت گذرنے پر

ذہنوں سے محو ہوتی ہے۔کوئی شاعر جب اپنے شاگرد کے کلام پر اصلاح دیتا ہے،کوئی لفظ رد کر کے دوسرا لفظ تجویز کرتا ہے یا الفاظ کی ترتیب بدل دیتا ہے یا کسی شعر کو یکسر قلم زد کر دیتا ہے اور اکثر اس کا سبب بھی بیان کر دیتا ہے تو گویا وہ اپنی تنقیدی نظر کا استعمال کرتا ہے اور اس کی یہ تنقیدی رائے شعری مسودات میں عموماً محفوظ رہ جاتی ہے لیکن جب ہم تنقید کے اولین نمونوں کی جستجو کرتے ہیں تو ہماری نظر قدیم شعراء کے دواوین پر جا کے ٹھہر جاتی ہے۔

''اُردو ہی نہیں بلکہ تمام عالمی ادب میں ادبی تنقید کے قدیم ترین نمونے شعری مجموعوں اور دیوانوں میں ملتے ہیں۔اکثر شاعروں نے اپنی نظموں اور شعروں میں یہ تایا ہے کہ ان کے نزدیک شعر کسے کہتے ہیں یا اچھی شاعری میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔مثلاً شکسپیئر کے نزدیک اپنے گرد پھیلی ہوئی دنیا کو گہری نظر سے دیکھنے،قوت تخیل سے اس میں رنگ آمیزی کرنے اور پھر لفظوں میں اس کی ہو بہو تصویر اتار دینے کا نام شاعری ہے۔حسان بن ثابت کی نظر میں اچھا شعر وہ ہے کہ جب پڑھا جائے تو لوگ کہہ اٹھیں، سچ کہا ہے۔عرفی کی رائے میں وہ شعر اچھا کہلانے کا مستحق ہے جو حسن صورت کے ساتھ حسن معنی بھی رکھتا ہے۔

ہمارے قدیم شعراء میں سے پہلے وجہی نے اپنے کلام میں شاعری کی بابت اپنی رائے ظاہر کی ہے۔اس کے نزدیک شاعر اسرارِ غیب کو بے نقاب کرتا ہے۔

ہوا جیو جب شعر بو بولنے　　خزینے لکیا غیب کے کھولنے

وہ شعری میں لفظ اور معنی دونوں کو برابر کی اہمیت دیتا ہے؟

کہ لفظ ہور معنی یو سب مل اچھے

ربطِ کلام اور سلاست کو وہ کلام کے لیے ضروری قرار دیتا ہے۔

جو بے ربط بولے تو بتیاں پچیس　　بھلا ہے جو ایک بیت بولے سلیس

غواصی کی رائے میں شاعری کو سلیقہ درکار ہے۔شاعر کو انتخاب و نشست الفاظ کی طرف خاص توجہ کرنی چاہیے۔اس کے نزدیک یک نئی نئی تشبیہیں شعر کے حسن میں اضافہ کرتی ہیں (ہزاروں نوے تشیہاں لائیا) اِن نشاطی شعر گوئی میں غور و فکر کو اہمیت دیتا ہے۔(ہزاروں سونچ بتیاں لکھ کر اچھتا) اور درسِ اخلاق کو شاعری کے لئے ضروری بناتا ہے۔(نصیحت نیں تو صنعت اس میں اچھتا)۔ ولی کو اس پر فخر ہے کہ اس کا کلام معنی سے لبریز (اے ولی یو شعر ہے لبریز معنی سر بسر) اور اس لیے اثر انگیز ہے (تیرا یو شعر جگ میں موثر ہے اے ولی)۔سراج اپنے شعور کو رواں (شعر رواں مرا ہے نہالِ زمین آب) اور پر سوز بتاتے ہیں (شعر پر سوز مرا نغمہ رواؤ دی ہے)

آبرو کے نزدیک شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں۔

شعر کے مضمون ستی جو قدر رہو ہے آبرو

قافیہ سیتی میلا یا قافیہ تو کیا ہوا

یہ تنقیدی نظریات کا منظوم اظہار ہے۔شعر میں قافیہ، ردیف اور وزن کی پابندی خیال کے مربوط اور مسلسل اظہار میں دشواری پیدا کرتی ہے۔لہذا اپنے قدیم شعری سرمایے کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے ہمیں ان قدیم ترین تنقیدی افکار کی جستجو ہوتی ہے جو نثر کے پیرائے میں بیان ہوئے ہوں۔اوران کے لیے ہمیں اُردو شاعروں کے تذکروں کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے۔

شعرائے اُردو کے تذکرے:

''ہمارے شعرا کے تذکرے کو جدید اصول کے مطابق ہ لکھے گئے ہوں تاہم ان میں بہت سی کام کی باتیں مل جاتی ہیں جو ایک محقق اور ادیب کی نظروں میں جواہر زیزوں سے کم نہیں۔ (بابائے اُردو مولوی عبدالحق)

شعرائے اُردو کے تذکرے ہمارا قدیم اور بیش قیمت ادبی سرمایہ ہیں اور ہماری زبان میں تنقید کی بنیاد انہی کے ذریعے پڑی۔ان تذکروں میں تنقید کے جو نمونے ملتے ہیں انہیں باقاعدہ تنقید کہنا تو مشکل ہے البتہ انہیں اُردو تنقید کا پہلا نقش ضرور کہا جاسکتا ہے۔تذکرے میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہوتی۔عام طور پر تذکرہ نگار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ شاعروں کو اپنے تذکرے میں جگہ دے اس لیے وہ مجبور ہوتا ہے کہ شاعر کا مختصر تعارف کرائے۔چند لفظوں میں اس کے کلام پر رائے دے اور آخر میں نمونے کے طور پر دو چار شعر پیش کردے۔چنانچہ تذکرہ نگار سے شاعر کی مفصل سوانح، مکمل سیرت اور بھرپور تنقید کی توقع عبث ہے۔اس اختصار سے مایوس ہوکر ہمارے بعض نقادوں نے ان تذکروں کو رڈی کا ایسا ڈھیر قرار دیا جس کا نذرِ آتش کردیا جانا ہی بہتر ہے۔کلیم الدین احمد کو ان تذکروں سے اختصار کے علاوہ پراگندگی اور جانب داری کی بھی شکایت ہے انہوں نے لکھا ہے کہ ان تذکروں میں شاعر کی زندگی کا بیان بہت مختصر ہوتا ہے اور کہیں تفصیل ملتی بھی ہے تو بے مصرف اور غیر تسلی بخش۔اسی طرح شخصیت کی تعمیر بھی ناکافی ہوتی ہے اور اگر بھولے سے کسی شاعر کی شخصیت نگار کی طرف بطور خاص توجہ کی جاتی ہے تو لفظوں کی کثرت میں معنی گم ہوجاتے ہیں۔تذکروں میں جو تنقیدی عنصر موجود ہے اس سے تو کلیم الدین احمد قطعی مایوس ہیں۔انہیں شکایت ہے کہ بیشتر شعراء کے کلام پر تو تنقید کی ہی نہیں جاتی اور جہاں کی جاتی ہے وہاں خیال رنگینی بیان اور مبالغہ آرائی کی نذر ہوجاتا ہے۔آخر کار کلیم الدین احمد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ :

یہ تنقید محض سطح ہے۔اس کا تعلق زبان، محاورہ اور عروض سے ہے لیکن یہ شاید کہنے کی ضرورت نہیں کہ تنقید

کی ماہیت اوراس کے مقصداوراس کے صحیح اسلوب سے بھی تذکرہ نویس واقفیت نہ رکھتے تھے۔ان تذکروں کی اہمیت تاریخی ہےاور دنیائے تنقید میں ان کی کوئی اہمیت نہیں۔شاید یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ تاریخی اہمیت اور تنقیدی اہمیت میں مشرقین کا فرق ہے۔اب ادبی دنیااس قدر آگے بڑھ گئی ہے کہ ہمیں تذکروں سے کچھ سیکھنا نہیں ہے جہاں تک تنقید کا واسطہ ہے ان تذکروں کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ (اُردو تنقید پر ایک نظر)

کلیم الدین احمد کی اس رائے سے اتفاق مشکل ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تذکروں سے جو تنقیدی معیار مرتب ہوتے ہیں ان پر آج کے ادب کو پرکھنا ممکن نہیں لیکن اس حقیقت سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ تنقید کے جدید پیمانے قدیم ادب کو جانچنے کے کام نہیں آسکتے جوادب جس زمانے میں تخلیق ہوا اسے اسی زمانے کے اصول اوراسی عہد کی پسند ناپسندی کی کسوٹی پر کسا جانا چاہیے۔اس سلسلے میں ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

''ہمیں تذکروں پر تنقیدی وتحقیقی قلم اٹھاتے وقت اس بات کو نظر انداز کرنا چاہیے کہ وہ ایک ایسے عہد، ماحول اورادبی فضا میں لکھے گئے ہیں جس میں نقد شعراور سخن فہمی کا معیار آج کے معیار سے بالکل مختلف تھا۔اٹھارویں اورانیسویں صدی عیسوی کے مذاق ادب،طرز تنقیداوراندازِ تذکرہ نگاری کو بیسویں صدی عیسوی کے نقطہ نگاہ سے جانچنا کسی طرح مناسب نہیں۔

(معیارِ شعروسخن)

ملک پرانگریزی تسلط سے پہلے ہمارا ادب عربی اور فارسی ادب سے متاثر بلکہ اس کوخوشہ میں تھااوران دونوں زبانوں کے علمائے ادب لفظ پر معنی کو ترجیح دیتے تھے۔شاعری کو پرکھنے کے لئے معانی، بیان، بدیع،عروض اورعلم قافیہ کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔یہی معیار نقد قدیم اُردو تنقید نے بھی مستعار لے لیےاورانہی پر شعروادکو پرکھا جانے لگا۔ چنانچہ فصاحت، بلاغت،تشبیہ، استعارہ،صنعت لفظی، صنعت معنوی،سلاست، روانی،خوش لہجگی،شریں کلامی، جادو بیانی جیسے الفاظ واصطلاحات کا استعمال قدیم تنقیدی خیالات میں عام ہوگیا۔کلیم الدین احمد انہیں محض لفاظی اورفضول عبارت آرائی کہتے ہیں۔سید عابد علی عابد انہیں ایسی اصطلاحات قرار دیتے ہیں جن کے پیچھے ایک جہان معنی پوشیدہ ہے۔ان کا خیال ہے کہ تذکرہ نگار اختصار کے خیال سیان اصطلاحوں کو سہارا لیتا ہےاورانہیں تنقیدی اشارات کے طور پر استعمال کرتا ہے۔آج ہم اپنے قدیم تنقیدی سرمایے سے اس درجہ ناآشنااوران علامتوں کے مفہوم سے اس حدتک ناواقف ہیں کہ سرسری طور پر انہیں لفظی بازی گری کا نام دے کرآگے بڑھ جاتے ہیں۔لکھتے ہیں :

تذکرہ نگار نے اختصار ملحوظ خاطر رکھا ہے۔تذکروں میں جہاں انتقادی اشارے پائے جاتے ہیں یا فیصلے صادر کیے جاتے ہیں وہاں پڑھنے والوں کی بہت بڑی تعداد اس امر سے آگاہ بھی نہیں ہوتی کہ تذکرہ نگار نے انتقاد کا فریضہ ادا کر دیا۔ یہ بظاہر بڑی عجیب وغریب بات معلوم ہوتی ہے لیکن ہے درست۔قصہ یہ ہے کہ اُردو کے قدیم تذکرہ نگاروں نے انتقادِادا دبیات کے سلسلے میں یہ بات فرض کر لی ہے کہ پڑھنے والے فارسی اور عربی کی ان کتابوں کا مطالعہ کر چکے ہیں جن میں اصول انتقاد کا ذکر بہ تفصیل کیا گیا ہے۔تذکرہ نگاروں نے یہ بھی فرض کیا ہے کہ پڑھنے والے ان تمام اصطلاحات سے آگاہ ہیں جو بیان، معانی اور بدیع سے متعلق ہیں اور جن پر عبور حاصل کیئے بغیر تذکروں کا مطالعہ عملاً بیکار ہے۔۔۔تذکرہ نویس جب فصاحت وبلاغت کے کلمات استعمال کرتے ہیں تو ان کا اصلاحی مفہوم مراد لیتے ہیں۔ہم ان کلمات کو اکثر محض عبارت آرائی تصور کرتے ہیں۔

اصول انتقاد ادبیات۔۔ص ۲۳۹

سید عابد علی نے اس رائے کا اظہار کرنے کے بعد مختلف تذکروں کی عبارتیں نقل کی ہیں اور مختلف اصطلاحوں کو ایسے معنی پہنائے ہیں جو کبھی تذکرہ نگار کے ذہن میں بھی نہ آئے ہوں گے۔گویا کلیم الدین احمد ایک انتہا پر ہیں تو یہ دوسری انتہا پر۔وہ تذکروں کی خوبیوں سے چشم پوشی کرتے ہیں تو یہ خامیوں سے۔ یہ تذکرے نہ تو خامیوں سے یکسر پاک ہیں نہ سراسر بیکار۔نقائص کے باوجود ان کی اہمیت مسلم ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تذکروں میں تنقیدی عنصر تلاش کرتے ہوئے اکثر مایوسی کا سامنا ہوتا ہے اور جگہ جگہ مختصر، مبہم اور بے معنی جملے نظر سے گزرتے ہیں جیسے :

میر سوداؔ کے بارے میں لکھتے ہیں :

ہر مصرع برجستہ اش سرآزاد بندہ

باقر حزیں کے بارے میں لکھتے ہیں:

شاعر ریختہ است صاحب دیوان

مصحفی سوداؔ کے ذکر میں لکھتے ہیں:

در روانی طبع نظیر خود نداشت

اور

غزلہائے دیوانش فصاحت و بلاغت زبان

کلام مظہرؔ کے بارے میں یوں رائے دیتے ہیں:

درتمام دیوانش فصاحت و بلاغت زبان

استادجلوۂ ظہوری دہد

مرزا اعلی لطف گلشنِ ہند میں قائم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''طوطی کو اقرار تلخ گفتاری کا سامنے اس شریں مقال کے اور خامہ مانی کو اظہار فرسودہ زبانی کا روبرو اس نازک خیال کے صفائے بندش سے اس کے آئینے کو طلب صفائی دام اور خجالت سے اس کلام رنگین کے گل شکشتہ رنگی سے کام۔۔۔

یہ نمونے یقیناً مایوس کن ہیں لیکن اس حقیقت کی طرف اشارہ ضرور ہے کہ ہر تذکرے کی اپنی جداگانہ خصوصیات ہیں۔کوئی تذکرہ نگار شعراء کے حالات کو زیادہ اہمیت دیتا ہے تو کسی کو زور سیرت نگاری پر ہے۔کوئی انتخا کلام کو اولین فرض خیال کرتا ہے تو کسی کی تنقیدی رائیں زیادہ دوقعت رکھتی ہیں۔جن تذکروں میں تنقید کلام کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ان میں خاص طور پر قابل ذکر میں میر کا نکات الشعراء مصحفی کا تذکرہ ہندی، شیفتہ کا گلشن بے خار اور محمد حُسین آزاد کا آبِ حیات۔آیئے ان تذکروں کا مختصر سا جائزہ لیں۔

میر کے تذکرے کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کی تنقیدی بصیرت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔وہ عام روش سے ہٹ کر بے لاگ رائے دیتے ہیں اور تنقیدی میں مروت کو خلل انداز نہیں ہونے دیتے۔نکات الشعراء کے مطالعے سے میرؔ کے جو تنقیدی نظریات مرتب ہوتے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ''شاعری محض گل و بلبل کا بیان نہیں، اس کے سوا بھی بہت کچھ ہے۔شاعر کو فکر تازہ کے پہلو بہ پہلو لطف زبان کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔اور الفاظ کے انتخاب میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔صفائی بیان اور الفاظ و محاورات کی صحت کا خیال ضروری ہے۔فصاحت و بلاغت کے اصول کسی صورت میں نظر انداز نہ ہونے چاہئیں۔''

میرؔ کی تنقید میں جو سب سے بڑی خامی نظر آتی ہے وہ ان کی تلخ گوئی ہے۔اکثر ان کا لہجہ اور ان کی تنقید طنز آمیز ہو جاتی ہے۔ حاتم جیسے بڑے شاعر بھی ان کے طنز اور تضحیک سے نہیں بچ سکے۔نکات الشعراء کے مرتب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی یہ رائے کہ ''تمام تذکرے میں ایک لفظ بھی میرؔ کے قلم سے ایسا نہیں نکلا جس سے ان کی خود بینی و خود پسندی یا بد دماغی اور تعلّی عیاں ہو۔'' درست نہیں ہے۔انہوں نے حاتمؔ کو مرد جاہل کہا ہے۔یقینؔ کے بارے میں میرؔ کی رائے ہے کہ ان میں شعر فہمی کی صلاحیت ہی نہ

تھی۔خاکسار اور یک رو پروان کی تنقید تلخ اور یک رخی ہے۔سید عبداللہ نے میرؔ کی تنقید کے بارے میں لکھا ہے:

''میر صاحب کی ناقدانہ عظمت کو ان کی سیرت کی اس خامی سے سخت نقصان پہنچا ہے۔فطرتاً انہیں نقد و نظر کی استعداد عطا ہوئی تھی لیکن انہوں نے طبیعت کی افسردگی اور غلبہ غم کے زیر اثر اپنی اس شاندار صلاحیت کو بے دردی اور تلخی کی صورت دے کر بڑا نقصان پہنچایا۔

شعرائے اُردو کے تذکرے طبع لاہور،۱۹۵۲ء ص۔۲۳

لیکن میرؔ کی اس کڑی تنقید کا ایک روشن پہلو بھی ہے۔جس طرح مالی چمن سے خس و خاشاک کو دور کر دیتا ہے اسی طرح تنقید نگار کا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ گھٹیا ادب کی پیداوار کو روکے۔میرؔ نے اپنی سخت تنقید سے یہ خدمت انجام دی۔فرومایہ شاعروں نے ان کی تنقید کے خوف سے شاعری سے کنارہ کر لیا اور باصلاحیت شاعر بھی محتاط ہو کر شعر کہنے لگے۔اُردو تنقید کی تاریخ میں نکات الشعراء کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔اس نے عد کے تذکرہ نگاروں کی تربیت کی اور تنقید کا ذوق پیدا کیا۔

مصحفیؔ نے اپنے تذکروں میں صاف در سادہ زبان استعمال کی۔وہ لفظوں کا جال نہیں بچھاتے بلکہ واضح الفاظ میں رائے دیتے ہیں۔ان کی تنقید صرف اہم شعراء تک محدود ہے لیکن ان کی رائے جچی تلی اور متوازن ہوتی ہے۔منصف مزاجی میں وہ میرؔ سے آگے ہیں اپنے حریفوں سے وہ انتقام نہیں لیتے بلکہ ان کے کلام پر بھی منصفانہ رائے دیتے ہیں۔انشاء سے ان کا معرکہ رہا لیکن جب ان کے کلام پر رائے دینے کا موقع آیا ہے تو دیانت داری سے کام لیتے ہوئے ان کی لیاقت کی تعریف کرتے ہیں۔یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہ کم عمری سے ہی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے لیکن خاص توجہ ریختہ یعنی اُردو کی طرف تھی۔ان کی مثنوی ''شیر و برنج'' کی روانی و فصاحت کی داد دیتے ہیں۔بقاؔ سے مصحفیؔ کے دوستانہ مراسم تھے لیکن انہوں نے بقاء کی خامیوں پر پردہ نہیں ڈالا۔

مصحفیؔ نے اپنے ہم عصروں کے متعلق جچی تلی رائیں دی ہیں۔سوداؔ کے اغلاط و توارد کا بھی ذکر کیا ہے لیکن روانی طبع کی بھی داد دی ہے اور انہیں اُردو قصیدے کا ''نقاش اول'' بتایا ہے۔وہ اپنے تذکروں میں نوجوان شعراء کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔اپنے شاگردوں کی خوبیوں اور خامیوں پر بھی بے لاگ رائے دیتے ہیں۔اپنے شاگرد آتشؔ کے بارے میں پیش گوئی کرتے ہیں کہ ''عمر نے وفا کی تو اپنے زمانے کے بے نظیر شاعروں میں سے ایک ہوگا۔لیکن دوسرے شاگرد رنگین کی کم علمی کا اعتراف کرتے ہیں۔

مصحفیؔ کی تنقیدی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے مسیح الزماں نے لکھا ہے:

''وہ کسی کی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے۔مسلم الثبوت استادوں کی شان میں قیصدہ نہیں لکھنے لگتے بلکہ ان کا صحیح مرتبہ سمجھنے اور بتانے کی کوشش کرتے ہیں معاصرین کے کلام پر غیر جانب داری سے نظر

ڈالتے ہیں۔دوست کی برائی یا مخالف کی تحسین کرنے میں نجی تعلقات کا خیال نہیں کرتے۔شاگردوں کی صلاحیت پہچانتے ہیں اوران کی دور بیں نظروں میں آفتاب بننے کی صلاحیت تاڑ لیتی ہے۔ان تذکروں میں معاصرین اور متاخرین کے کلام پر جس خاص توجہ اور تجزیے کے ساتھ رائے دی گئی ہے وہ انہیں تذکروں کے روایتی خصوصیات سے علیحدہ کرتی ہے اور پڑھنے والے کو جگہ جگہ تنقیدی تصنیف کا مزہ ملتا ہے۔'' اُردو تنقید کی تاریخ، اکادمی ایڈیشن ۱۹۸۳ء صفحہ ۱۱۰

شیفتہؔ اپنے عہد کے باشعور اور ذمہ دار نقاد ہیں۔ان کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے گلشن بے خار میں شعراء کے مستند حالات اور عمدہ کلام فراہم کر کے آئندہ تنقید کے لیے راہ ہموار کی۔شیفتہ گہری تنقیدی نظر رکھتے تھے۔انہوں نے میرؔ کی غزلوں کو ان کے قیصدوں سے بہتر مانا ہے اور سوداؔ کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی غزل قصیدے سے اور قصیدہ غزل سے بہتر ہوتا ہے۔ مصحفیؔ کے منتخ اشاعر کی عمدگی کو انہوں نے سراہا ہے۔غالبؔ بھی شیفتہؔ کی تنقیدی نظر کے قائل تھے۔ایک فارسی شعر میں غالب نے کہا ہے کہ اگر میرا کوئی شعر مصحفی خاں شیفتہ کو پسند نہیں آتا تو میں اسے اپنے دیوان میں شامل نہیں کرتا۔اس میں مبالغہ سہی لیکن گلشنِ بے خار کے مطالعے کے بعد شیفتہ کی تنقیدی بصیرت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

کم کتابوں کو ایسی مقبولیت ہوتی ہے جو محمد حسین آزاد کی آب حیات کے حصے میں آئی۔اس تذکرے میں آزاد نے شاعروں کی منھ بولتی تصویریں پیش کی ہیں اور تفصیلی حالات بیان کیے ہیں۔لیکن ان کی تنقید عیب سے خالی نہیں۔ان کی تنقید کو سب سے زیادہ نقصان عبارت آرائی سے پہنچایا۔ بیان کی صفائی پر وہ زبان کے چٹخارے کو ترجیح دیتے ہیں۔اور یہ بات تنقید کے تقاضے کے خلاف ہے۔دوسری بات جو ایک تنقید نگار کو زیب نہیں دیتی وہ تعصب اور جانب داری ہے۔آبِ حیات میں آزاد نے جابجا شاعروں کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔وہ طرح طرح انشاء کو بڑھانے اور مصحفیؔ کو گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔مومن کو اول تو آزاد نے نظر انداز کرنا چاہا۔ یہ ناممکن ہوگیا تو آخر کار ان کا رتبہ گھٹانے کی کوشش کی ہے۔اپنے استاد ذوق کو غالب پر ترجیح دی۔استاد پرستی کا یہ حال ہے کہ چیچک کے داغوں پر بھی ستاروں کا گماں ہوتا ہے۔

''رنگ سانولا، چیچک کے داغ بہت تھے۔کہتے تھے کہ نو دفعہ چیچک نکلی تھی۔مگر رنگت اور داغ کچھ ایسے مناس اور موزوں واقع ہوئے تھے کہ چمکتے تھے اور بھلے معلوم ہوتے تھے۔

آبِ حیات میں غالبؔ کا ذکر دیکھیے تو پہلی نظر میں تعریف کا گمان ہوتا ہے لیکن غور کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ خوبیاں نہیں عیب گنا رہے ہیں۔آزاد نے جب قلم اٹھا تو زمانے کا ورق الٹ چکا تھا۔سرسید ادب میں تبدیلوں پر زور دے رہے تھے۔خود آزاد انگریزی

صندوقچوں میں بھرے خزانے کے قدردان اور انگریزی لالٹینوں کے قائل تھے مگر نئی تنقید ان کے لیے دور کی چیز ہی رہی اور وہ مشرقی تنقید کے حصار سے باہر نہ نکل سکے۔ ستھرا ادبی ذوق رکھنے کے باوجود آبِ حیات میں آزاد تنقید کا کوئی مثالی نمونہ پیش نہ کر سکے۔

تذکروں میں تنقید کے اس مختصر جائزے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تذکروں میں تنقید موجود تو ہے مگر نقائص سے یکسر پاک نہیں۔ دراصل یہاں ہماری تنقید کا پہلا نقش ملتا ہے اور پہلا نقش بے عیب نہیں ہوسکتا۔ ملک پر برطانوی تسلط کے بعد ہماری زبان نے مغربی تنقید سے جو کچھ سیکھا اس کے سامنے یہ قدیم تنقید زیادہ کارآمد نظر نہیں آتی اور یہ تذکرے بے مصرف نظر آتے ہیں ورنہ بقول حنیف نقوی کے حقیقت یہ ہے کہ :

> ''تذکرے ہمارے سرمایہ ادب کا ایک گراں قدر حصہ ہیں جسے نظر انداز کر کے نہ تو ہم اُردو شاعری کے مطالعے ہی میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور نہ اپنے ادبی و تنقیدی شعور کے آغاز و ارتقاء کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔ ہم نے اپنے قدیم شاعروں کو نہیں تذکروں کے ذریعے جانا اور پہنچانا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہماری ناقدانہ بصیرت بھی انہیں تذکروں کی فضا میں پروان چڑھی ہے۔

۲۱۔۲ : تذکرے، تقریظیں مشاعرے، اساتذہ کی اصلاح

اُردو ادب میں جتنی بھی اضافہ ہیں وہ فارسی ادب سے اُردو ادب میں داخل ہوئیں ہیں۔ چونکہ یہ تذکرہ نگاری فارسی ادب کی دین ہے۔ اس لئے فارسی تذکرہ نگاری کے جو اصول ہیں۔ ان ہی اصولوں کو لے کر اُردو میں تذکرے لکھے گئے۔ یعنی چند جملوں اور فقروں میں تنقیدی خیالات کو پیش کرنا۔ قدیم زمانے میں مشاعروں میں شعراء کے کلام پر جو داد دی جاتی تھی۔ یہ بھی ایک قسم کی تنقید ہے جو ایک شاعر دوسرے شاعر کا کام سن کر دیا کرتا تھا۔ بعض اوقات شعراء کے کلام پر اعتراضات بھی کیے جاتے تھے۔ جن سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کے لوگوں کے ذہن میں شعر کی اچھائی و برائی کا ایک مخصوص تصور ضرور موجود تھا۔ اساتذہ کی اصلاحوں (درستی) اور طریقوں میں بھی تنقیدی روایت ملتی ہے۔

اُردو تذکرے ہو بہو فارسی تذکروں کی طرح ہیں۔ یہاں بھی تین باتیں پائی جاتی ہیں۔ (۱) شاعر کے مختصر حالات (۲) کلام پر تذکرہ نگاری کی معمولی رائے۔ (۳) کلام کا انتخاب

اکثر تذکرہ نگاروں نے تذکرہ نگاری کے لئے اُردو زبان کی بجائے فارسی استعمال کیا ہے۔اُردو تذکروں میں بھی بعض ایسے تذکرے ہیں جو کسی خاص نقطہ نظر سے کسی مخصوص حلقے کی ترجمانی کرنے کے لئے لکھے گئے۔تذکروں میں سب سے پہلے جس بات کی طرف توجہ دی گئی۔وہ شعراء کے حالات ہیں جن سے شاعری کی پیدائش اس کا خاندان زندگی،شخصیت،تعلیم وتربیت سے پہلے جس بات کی طرف توجہ دی گئی۔وہ شعراء کے حالات ہیں جن سے شاعر کی پیدائش کا خاندان،زندگی،شخصیت،تعلیم وتربیت اور ماحول سے واقفیت ہوتی ہے۔تذکرے شعراء کی افتادِ طبع اور ماحول کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔یہ تذکرے اپنی اہمیت کے لحاظ سے بے شک تاریخی بھی ہوتے ہیں۔کیونکہ تذکرہ نویس شاعر پر مکمل تنقیدی مضمون نہیں لکھتے تھے کہ جس کی وجہ سے پس منظر اتنا اجاگر ہو جائے کہ اس کی حیثیت تاریخی سے ادبی ہو جاتی ہے۔بقول ڈاکٹر سیّد عبداللہ نکات کی سیرتوں کو اگر اس اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہم اس کے اختصار وایجاد میں وہ پُرمعنی اور مصورانہ نظر پاتے ہیں۔جو تفصیل میں نہیں مل سکتی۔''

سیرت نگاری اور ماحول کی تصویر کشی کی خصوصیت اُردو کے بیشتر تذکروں میں ملتی ہے لیکن اس سلسلے میں نکاۃ الشعراء سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔میر حسن اور مصحفی کے تذکروں میں بھی یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔مصطفیٰ خان شیفتہ کا تذکرہ ''گلشن بے خار'' بھی سیرت نگاری اور ماحول کی تصویر کشی میں اہمیت رکھتا ہے۔

تذکروں کے سلسلے میں دوسری اہم چیز'' کلام پر رائے زنی ہے۔'' شاعروں کے کلام پر عام طور سے ذوقی اور وجدانی رائے دی جاتی ہے۔تذکرہ نگار کو تلاش کرنا جو دوسرے افراد کے ذوق سے ہم آہنگ ہو سکے۔بیکاری بات سے مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو میر کے تذکرے میں رائے معیاری نظر آتی ہے۔ان کی رائے میں خلوص ہوتا ہے۔اگر وہ کسی پر سخت نقطہ چینی یا تنقید کرتے ہیں تو اس میں گروہ بندی کا دخل نہیں ہوتا۔البتہ ہمدردی کی بجائے بے دردی کی جھلک کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ڈاکٹر عبداللہ کا یہ خیال صحیح ہے کہ نکات میں تنقیدی مواد کافی سے زیادہ ہے۔اس میں شک نہیں کہ میر کی تنقید میں یہ خامی ہے۔لیکن صرف اس وجہ سے میر کو تنقید نگار کہنے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔کیونکہ میر کی تنقید میں بے دردانہ رائے بہت کم ہیں۔زیادہ تر رائیں معتدل اور جچی تلی ہیں۔

میر کی تذکرے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ میر نے ہر شاعر کے مرتبے کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔مثلاً میر نے مرزا محمد رفیع سودا اور خواجہ میر درد جیسے چوٹی کے شعراء کی تعریف میں منفی اور مسجع عبارت استعمال کی لیکن ان شعراء سے جو کمتر درجے کے تھے۔ان کے کلام پر اظہار خیال کرتے وقت میر کا لہجہ اور انداز بیان اپنے آپ ہی تبدیل ہو جاتا ہے۔

غرض تذکرہ نگاروں کی صاف گوئی سے ان کے تنقیدی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔کہ انہوں نے کسی تعصب اور فرقہ بندی کے پیش نظر بعض شعراء کے خلاف رائے ہیں دی۔بلکہ حقیقت میں جو کچھ محسوس کیا۔اس کو الفاظ میں پیش کیا۔تذکرہ نگاروں کے نزدیک

صاف گوئی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یوں تو میر حسن کا تذکرہ صاف گوئی میں میر تقی میرؔ کا مقابلہ میں پیش کیا۔لیکن پھر بھی ان کے کلام میں بھی متوازن رائیں ملتی ہیں۔لیکن میر حسن نے اپنے تذکرے میں میرؔ اور سوداؔ کے کلام پر حسین انداز میں رائے دی ہے۔انشاءاللہ خاں انشاءاور جرات کا بیان مختصر ہے۔

مصطفیٰ خان شیفتہ کا تذکرہ ''گلشن بے خار'' بھی تنقیدی اعتبار سے بلند درجہ رکھتا ہے کیونکہ شیفتہ نے بڑے بڑے شاعر سے متعلق اپنی رائے پیش کی ہے۔اوران کی خامیوں کا اجاگر کیا ہے۔مثلاً شیفتہؔ نے میرؔ سے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ وہ غزل گوئی کے بادشاہ تھے۔ان سے بڑا غزل گوشاعر اُردو میں پیدا نہیں ہوا۔مثنوی انہوں نے کہی ہے اور خوب کہی ہے۔ان کی غزلوں میں داخلی رنگ غالب ہے۔اور مثنویوں میں خارجی البتہ قصیدہ ان کا میدان نہیں تھا۔

شیفتہ نے ''انشاءاللہ خاں انشاء'' سے متعلق کہا کہ وہ استاد ضرور تھے انہوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔لیکن سنجیدگی کو اپنے پاس آنے نہیں دیا۔جس کی وجہ سے ان کی تقریباً تمام شاعری غیر سنجیدہ ہے۔

تنقیدی رائے دیتے وقت تذکرہ نویس شاعروں کا ایک دوسرے سے مقابلہ بھی کرتے تھے لیکن یہاں بھی انہوں نے اختیار سے کام لیا۔انہوں نے اُردو شعراء کا فارسی شعراء سے ہی مقابلہ نہیں کیا بلکہ اُردو شعراء کا آپس میں بھی مقابلہ کیا ہے۔اور یہ بھی بتایا ہے کہ اُردو کے کون سے شاعر فارسی کے کس شاعر سے متاثر تھے۔مثلاً میر تقی میرؔ، شیفائی سے اور غالبؔ بیدل سے متاثر تھے۔وغیرہ وغیرہ۔

تذکرہ نویسیوں نے تذکروں میں شعراء کے کلام پر جو اصلاح دی ہے۔اس سے ان کی تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔لیکن اصلاح اس زمانے کے رواج کے مطابق لفظی ہوتی تھی معنوی پہلو سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا لیکن تذکروں کے مطالعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شعر سے متعلق یوں ہی کوئی رائے قائم نہیں کی گئی بلکہ تذکرہ نویس فنی اصولوں کے روشنی میں شعراء کے کلام پر غور وفکر کرتے تھے۔ان تذکروں کا ایک اہم تنقیدی پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے مطالعے سے اس زمانے کے شعر واد کے معیار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۱) تقریظیں: تقریضوں کا شمار اُردو تنقید کے قدیم نمونوں میں ہوتا ہے۔تقریظ یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔جس کے لفظی معنی تعریف کرنے کے ہیں لیکن عربی زبان میں عرصہ دراز تک یہ لفظ تنقید کے معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔قبل اسلام عرب میں عکاظ کے مقام پر ایک بڑا میلہ لگتا تھا۔جس میں دور دراز کے شاعر شریک ہوکر اپنا کلام سناتے تھے۔اس موقع پر صدر جلسہ جو ایک قابل عمر رسیدہ آدمی ہوتا وہ شعراء کے کلام پر تبصرہ کرتا تھا اور مختلف شعراء کے کلام کا ایک دوسرے مقابلہ بھی کرتا تھا۔اس طریقہ کی

بدولت شعراء کے کلام کی خوبیوں اور خامیاں اجاگر ہو جاتیں۔اس طریقے کو ''تقریظ'' کہا جاتا تھا۔پھر جب اسلام کی بدولت عربوں میں حق صداقت اور غیر جانبداری کی خوبیاں پیدا ہوئیں۔تقریظ صحیح معنوں میں بے لاگ تبصرہ بن گئی۔لیکن رفتہ رفتہ عرب شعراء میں انصاف پسندی ختم ہوگئی۔اور انعام واکرام کا لالچ ان سے دلوں میں پیدا ہوا تو تقریظ تقریظ نہ رہی بلکہ تعریف وتوصیف بن گئی اور اس طرح تقریظ کا مفہوم بدل گیا۔یعنی شعراء کے کلام کی خوبیاں اور خامیاں بیان کرنے کے بجائے صرف خوبیاں بیان کی جانے لگیں اس طرح جب یہ روایت اُردو میں پہنچی تو اس سے مراد وہ عبادت قرار پائی جو کسی کتاب کی تعریف میں لکھی جائے اور جسے کتاب کی تعریف میں لکھی جائے اور جسے کتاب میں شامل کر دیا جائے۔مثلاً جب کوئی نقاد کسی شاعر یا ادیب کے تخلیقی کارنامے کے صرف محاسن بیان کرتا ہے۔اس کے عیوب سے چشم پوشی کرتا ہے تو اسے تقریظ کہنے لگے اور اس کے برخلاف اگر نقاد صرف مصائب ہی پیش کرے گا اور کلام کی خوبیوں کو مکمل طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے۔لیکن ان تقریظوں سے کچھ ایسے تنقید اشارے بھی مل جاتے ہین جس سے لکھنے والے کے مذاق شعر اور معیار نقد کا انداز ہو جاتا ہے۔اُردو میں تقریظیں بکثر موجود ہیں لیکن ان کی تنقیدی اہمیت بہت کم ہے۔کیونکہ اس میں سوائے کتاب کی تعریف وتوصیف کے کچھ اور نہیں ہوتا۔اور تقریظوں میں تصنیف سے متعلق صحیح تنقید موجود نہیں رہتی۔لیکن پھر بھی تنقیدی شعور کی کچھ نہ کچھ کارفرمائی اس میں نظر آجاتی ہے۔

مرزا غالب نے اپنے شاگردوں اور دوست احباب کے کلام پر کئی تقریظیں لکھی ہیں۔اس میں تعریف وتوصیف کا عنصر نمایاں ہے مصطفیٰ خان شیفتہ کے تذکرے گلشن بے خار میں بھی غالب اور مومن کی تقریظیں پائی جاتی ہیں۔غال اور مون کے علاوہ دوسرے ادیبوں اور شاعروں نے بھی بکثر تقریظیں لکھی ہیں۔تقریظ لکھنے والے عام طور پر تعریف وتوصیف کو پیش نظر رکھتے ہیں اور خامیوں کو درگزر کرتے ہیں۔لیکن ان سب تقریظ لکھنے والوں کے یہاں تنقیدی شعور کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔اور ساتھ ہی ساتھ کچھ ایسے تنقیدی اشارے کبھی مل جاتے ہیں۔جس سے لکھنے والے کے مذاق سخنا کا پتہ چلتا ہے۔

ا) **مشاعرے :** ہر تخلیق کار مثلاً: سنگ تراش، مصور، معمار، مغنی یا موسیقار سبھی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی تخلیق ان کا فن عوام تک پہنچے اور لوگ انہیں پسند کریں۔شاعر اور ادیب بھی اس خواہش سے مبرّ انہیں ہیں۔جب انسان نے پہلی بار شعر کہا تو اس کو احساس ہوا کہ یہ ایک اچھوتا خیال ہے اور اسے یہ خواہش ہوئی کہ وہ دوسروں کو اسے سنائے۔جب اسے داد ملی تو نہ صرف وہ خوش ہوا بلکہ اس کا حوصلہ بھی بڑھ گیا۔اور پھر اس کے دل میں خوب سے خوب تر شعر کہنے کی خواہش پیدا ہوئی۔

ابتدائی زمانے میں نشر واشاعت کی سہولتیں نہیں تھی۔لوگ ایک جگہ اکٹھا ہوئے تھے اور اپنی اپنی شعری تخلیقات سنایا کرتے تھے۔سامعین ان تخلیقات کو سن کر کبھی داد دیتے تھے اور کبھی ان پر تنقید کرتے۔مشاعرے کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔نشر واشاعت کی

تمام سہولتوں کے فروغ کے باوجود بھی مشاعرے کی اہمیت آج بھی اسی طرح برقرار ہے کیونکہ مشاعرے میں سامع اور شاعر کے درمیان راست تعلق ہوتا ہے۔اور سامعین کے براہ راست ردِعمل کی وجہ سے شاعر کو اپنے شعر کے حسن وقبح سے بہ خوبی واقفیت ہوتی ہے۔

۲) قبح : مشاعروں کا آغاز عرب میں ہوا۔عرب میں عکاظ کے مقام پر ہر سال ایک میلہ لگتا تھا۔اس میلے میں ہر فن کے ماہر کے ساتھ شعراء اپنے علم وفن کا مظاہرہ کرتے تھے۔عکاظ کے میلے میں عرب کے کونے کونے سے سخن گو اور سخن شناس جمع ہوتے تھے جس جس شاعر کا قیصدہ سب سے بہتر ہوتا تھا اس کے قصیدے کو سونے کے پانی سے حریر (مخمل) کے کپڑے پر لکھ کر کعبہ کی دیوار پر لٹکایا جاتا تھا۔

اگر غور کریں تو اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مشاعرہ تنقید کی ابتدائی منزل ہے کیونکہ یہیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کے کلام نے سامعین کو متاثر کیا یا انہیں کلام پسند نہیں آیا۔اگر سامعین شاعر کے کلام سے متاثر ہو تو بے ساختہ ان کی زبان سے واہ نکل پڑتی ہے۔اور جنہیں شعر پسند نہیں آتا تو وہ خاموش رہتے ہیں یا شور کرتے ہیں۔زمانہ قدیم سے آج تک شاعر کی تعریف وتنقید کرنے کا یہی طریقہ رائج ہے۔

مشاعروں کی ایک اپنی مخصوص تہذیب اور ایک روایت ہوتی ہے۔پرانے زمانے میں جب مشاعرہ منعقد ہوتے تو اس کے لئے مخصوص اہتمام کیا جاتا تھا۔مشاعرے کا صدر ایسے شخص کو بنایا جاتا جو علم وفضل میں سب سے بڑھ کر اور فن شاعری پر عبور رکھتا ہو۔جو شاعر کا کلام سناتا، اس کے سامنے شمع رکھ جاتی۔مبتدی شعراء کو پہلے پڑھنے کے لئے کہا جاتا تھا اور اس کے کلام کو سن کر لوگ اس کی تعریف یا تنقید کرتے۔صدر مشاعرہ ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیتا تھا۔

جب کوئی مبتدی اپنا کلام سناتا اور اساتذہ فن اس کی تعریف کرتے تو یہ تعریف اس کے لئے سند بن جاتی تھی۔سوداؔ کے زمانے میں ایک مشاعرے میں ایک نوعمر لڑکے نے غزل پڑھی۔اس مشاعرے میں سوداؔ بھی شریک تھے مطلع کا شعر سن کر سوداؔ بے ساختہ چونک پڑے اور انہوں نے اس شعر کی بہت تعریف کی جو اس غزل کا مطلع ہے۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

علامہ اقبال نے بھی اس طرح اپنے کم عمری میں ایک مشاعرے میں غزل سنائی تھی۔اس مشاعرے میں مرزا ارشد گورگانی بھی شریک تھے جب اقبال نے اپنی غزل پڑھی تو غزل کے ایک شعر پر ارشد گورگانی بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھے اور انہوں نے اقبال

کو گلے لگایا اور ان کے اس شعر کو سراہا جو درج ذیل ہے۔

گر نا رنہیں کہنے سے برا مانتے ہو تم
میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں صحیح

سوداؔ نے مسکرا کر کہا ''درایں چہ شک'' یہ فقرہ شعر کے آخری حصے کی وجہ سے کہا گیا تھا۔ جہاں میں نازنیں صحیح کے الفاظ آئے ہیں۔اس لطیفے کے پس منظر میں اہم بات یہ تھی کہ انشاء بہت خوب رو، خوبصورت تھے۔

مشاعرے ایک خاص سماجی نظام کی پیداوار ہوتے ہیں۔زمانہ قدیم میں برسر اقتدار شخصیتوں نے جب مشاعروں کی سرپرستی کی تو اس کے پس پشت یہ خواہش بھی چھپی ہوئی تھی کہ عوام انہیں علم دوست اور ادنواز سمجھیں۔مشاعرے اُردو کی شعری روایات میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔مشاعرے اس لئے اہمیت کے حامل ہیں۔کیونکہ زمانہ قدیم میں تفریح کے ذرائع بہت ہی محدود تھے۔مثلاً: پتنگ بازی، مرغ بازی اور گانا بجانا وغیرہ۔مشاعروں سے ذہنی مسرت بھی حاصل ہوتی ہے اور عوام کے ادبی ذوق کی ترتیب بھی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں اُردو زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں مشاعرے کا تصور موجود نہیں ہے۔البتہ ہندی شاعری میں سامعین کی جو روایت پڑی اس پر اُردو کا براہ راست اثر ہے۔

۲۔۱۲۲ : خود جانچنے کے سوالات

۱) تذکرہ کی خصوصیات لکھئے۔
۲) اُردو میں تقریظیں لکھنے کا مقصد کیا تھا؟
۳) ابتداء میں عربی ادب میں لفظ تقریظیں کن معنوں میں استعمال ہوتا ہے؟

۲۔۲۳ : اس اکائی کے سوالات

۱) مشاعروں کا آغاز کب ہوا اور کس طرح ہوا؟
۲) شعر کہنے کی ابتداء کس طرح سے ہوئی؟
۳) شفتہ کے اپنے تذکرہ ''گلشن بے خار میں میر کے متعلق کس قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا؟
۴) میر کی تذکرہ ''نکات الشعراء'' کی خوبیاں بیان کیجئے۔

۲۔۲۴ : فرہنگ

تخیل --- خیال

شعور --- سمجھ/عقل

تذکرہ -- ذکر/چرچا

تقریظیں -- کتاب اور مصنف کی تعریف

روایات -- رواج

جمود --- جمع ہوا

۲۵۔ا : سفارش کردہ کتابیں

اُردو تنقید کی تاریخ --- مسیح الزماں

ترقی پسند تنقید --- خلیل الرحمٰن

ادب اور زندگی --- مجنوں گورکھپوری

تنقیدی جائزے --- سید احتشام حسین

اُردو تنقید --- عبادت بریلوی

Unit-3

اکائی-3

روایتی نقاد

اکائی 3 :

اکائی کے اجزاء

۳۱۲۶ : مقصد

۳۔۲۷ : تمہید

۳۔۲۸ : روایتی نقاد

☆ مولانا حالؔی

☆ شبلؔی نعمانی

☆ محمد حسین آزادؔ

۲۹۔ : خود جانچنے کے سوالات

۳۰۔ : اس اکائی کے اہم سوالات

۳۱۔ : فرہنگ

۳۔۳۲ : سفارش کردہ کتابیں

۳۔۲۶ : مقصد

اس اکائی کے پڑھنے کے بعد طلباء سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ :

☆ روایتی نقاد، مولانا حالؔی ،شبلؔی نعمانی، محمد حسین آزادؔ، اور دیگر نقاد کے بارے میں جانیں گے۔

۳۔۲۷ : تمہید

گذشتہ اکائی میں ''اُردو تنقید کے قدیم نمونے'' تذکرے تقریظیں، مشاعرے، اساتذہ کی اصلاحیں وغیرہ معلومات سے واقف ہو چکے ہیں۔اب اس اکائی نمبر۴ میں روایتی نقاد، مولانا حالؔی، شبلیؔ نعمانی، محمد حسین آزاد وغیرہ ان تمام نقادوں کی معلومات حاصل کریں گے۔

3.28: روایتی نقاد

مولانا الطاف حسین حالؔی :

مولانا الطاف حسین حالؔی کا شمار اُردو ادب کے معماروں ہوتا ہے۔انہوں نے نثر و نظم کے مختلف شعبوں میں اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔ایک طرف وہ بلند پایہ شاعر ہیں تو دوسری طرف ایک بڑے سوانح نگار اور اعلیٰ پایہ کے قصہ نویس بھی ہیں۔ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ بہ حیثیت نقاد کے والی اُردو ادب میں ایک ارفع و بلند مقام رکھتے ہیں۔یوں تو تنقید کے ابتدائی نقوش محمد حسین آزاد کی تصنیف ''آب حیات'' میں نظر آتے ہیں لیکن اُردو میں صحیح معنوں میں تنقید نگاری کا آغاز حالؔی کے ذریعے ہوتا ہے۔حالؔی کے تنقیدی خیالات و نظریات کی جھلک ان کی سوانحی تصانیف حیاتِ سعدی، یادگار غالبؔ اور حیاتِ جاوید میں بھی نظر آتی ہیں۔ساتھ ہی ساتھ حالؔی نے چند تنقیدی مکالے بھی لکھے ہیں۔

حالؔی کے تنقیدی شعور کی نشو و نما میں دو باتوں کا بڑا عمل و دخل ہے۔ایک ان کی افتادِ طبع اور دوسرا اس زمانے کے حالات حالی زندگی کو حرکت سمجھتے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ زمانے کا رُخ جدھر کو ہے انسان کو بھی ادھر ہی مڑنا چاہیے۔حالات میں ناہمواری کا احساس اور پھر ان کو ٹھیک کرنے کی خواہش انسان کے دل میں اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی۔جب تک وہ زندگی کو تنقیدی نقطہ نظر سے نہ دیکھے۔زندگی اور ادب دونوں کو تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھنے کا خیال حالی کے دل میں اس وقت پیدا ہوا جب سرسید نے انہیں اس جانب متوجہ کیا۔مرزا غالب اور مصطفیٰ، خان شیفتہ کی صحبت نے بھی حالؔی کے تنقیدی شعور کو جلا بخشی، اور آخر میں مغربی ادب نے بھی ان کے تنقیدی شعوری کو جلا بخشی اور آخر میں مغربی ادب نے بھی ان کے تنقیدی شعور کو بڑھایا۔حالؔی فطری طور پر ایک بیدار مغز آدمی تھے۔اس لیے انہوں نے جدید چیزوں کو خوش آمدید کہا۔

حالؔی فنون لطیفہ کی اہمیت کے قائل تھے۔فنونِ لطیفہ اور شاعری ان کی نظر میں بے کار کی چیزیں نہیں تھیں۔وہ شعر کی اچھائی اور برائی دونوں کے قائل تھے۔وہ چاہتے تھے کہ شاعری کا استعمال کسی اچھے اور بلند مقصد کے لیے کیا جائے۔

ملٹن کی طرح حالؔی کا بھی یہ خیال ہے کہ شاعری اس وقت تک شاعری ہے جب تک اس کے ذریعے سماج کی فلاح و بہبودی

کا کام انجام دیا جاتا ہے۔ حالؔی کے نزدیک شاعری کا مقصد جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے۔ اس سے ان کی یہ مراد تھی کہ انسان کے دل میں ایک قسم کی جولانی وامنگ کو پیدا کیا جائے۔ حالؔی کا یہ کہنا تھا کہ مذہ واخلاق کا شاعری سے گہرا تعلق ہے۔ ان کے نزدیک شعرا گرچہ راہِ راست ''علم اخلاق کی طرح تلقین وہدایت نہیں کرتا لیکن از روئے انصاف اس کو اخلاق کا نائب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں۔''

حالؔی کا خیال ہے کہ شاعری اور سوسائٹی ان دونوں کا چولی اور دامن کا ساتھ ہے۔ کیونکہ سوسائٹی کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ حالؔی قافیہ، ردیف اور اوزان کی پابندی شاعری کے لیے ضروری نہیں سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کا یہ بھی کہا ہے کہ وزن سے شعر کا اثر بڑھ جاتا ہے۔ ساتھ ہی حالؔی کے نزدیک صرف عروض کا جاننے والا شاعر بڑا شاعر نہیں ہوسکتا۔ شاعر یا غیر شاعر میں اس بات کا فرق ہے۔ شاعر معنی کا خیال لکھتا ہے۔ اور غیر شاعر کے نزدیک قافیہ پیائی شاعری کی معراج ہے۔

اچھا شاعر ہونے کے لیے حالؔی نے تین شرطیں ضروری قرار دی ہیں۔ تخیل، کائنات کا مطالعہ، تفحیص الفاظ (۱) تخیل کی قوت خداد ہوتی ہے۔ اکتسا سے یہ حاصل نہیں ہوتی۔ شاعری کے لئے اس قوت کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ (۲) کائنات کے مطالعے: سے حالؔی کی مراد صرف یہ نہیں کہ قدرتی مناظر کا مطالعہ کیا جائے بلکہ اس سے ان کی مراد انسانی نفسیات کا مطالعہ بھی ہے۔ حالؔی کا کہنا ہے کہ کائنات کے مطالعے میں انسان کو اگر نظر انداز کیا جائے تو قوت متخیلہ بھی کام نہیں کرسکتی۔ (۳) تفحص الفاظ: یعنی الفاظ کے صحیح استعمال کے بغیر شاعر اپنا مافی الضمیر اچھی طرح پیش نہیں کرسکتا۔

حالؔی ملٹن کی اس بات سے متفق ہیں۔ کہ شاعری میں سادگی، اصلیت سے مراد حقیقت ہے۔ اور جوش سے ان کا یہ مطلب ہے کہ شعر ایسے بے ساختہ اور موثر پیرایے میں بیان کیا جائے کہ ایسا معلوم ہو کے شاعر نے اپنے ادارے سے یہ مضمون نہیں باندھا۔ بلکہ خود مضمون نے شاعر کو باندھے کے لئے مجبور کیا۔ حالؔی کے تنقیدی نظریات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی تنقید میں مشرقی ومغربی تنقید کا امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کے تنقیدی خیالات ونظریات گہری سوچ کا نتیجہ ہیں۔ اور ان میں خلوص وسچائی ہے۔ تصنع و بناوٹ سے ان کی تنقید بالکل پاک ہے۔ حالؔی کی تحریروں میں عملی تنقید تین جگہ ملتی ہے۔ مقدمہ شعروشاعری میں دوسرا سوانح عمریوں، تیسرا ان کے تبصروں میں حالؔی کے تصانیف کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نظری تنقید کے قائل نہیں۔ عملی تنقید کی ان کی نظر میں بڑی اہمیت ہے۔

حالؔی کو مغربی تنقید سے گہری دلچسپی تھی۔ لیکن انگریزی زان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے مغربی تنقید سے وہ پوری طرح استفادہ نہ کرسکے۔ چونکہ اُردو میں ملٹن اور میکالے کی کتابوں کا ترجمہ ہوا تھا۔ اس لئے حالؔی کو صرف ملٹن اور میکالے کے خیالات پر ہی قناعت کرنی پڑی۔ حالانکہ بحیثیت نقاد کے ملٹن اور میکالے انگریزی ادب میں کوئی بلندی مقام نہیں رکھتے تھے۔ تنقید کے سلسلے میں حالؔی سے ایک غلطی یہ بھی سرزد ہوئی کہ عربی اور عربی نقادوں سے بہ خوبی واقف ہونے کے باوجود بھی انہوں نے عربی نقادوں کے

خیالات سے فائدہ نہیں کیا۔

حالؔی اُردو کے پہلے نقد ہیں جنہوں نے مربوط شکل میں اپنے تنقیدی خیالات کو پیش کیا۔اس لئے حالؔی کو جدید تنقید کا علم بردار کہا جاتا ہے۔حالؔی نے ماحول، حالات اور واقعات کو مدنظر رکھ کر تنقید کی۔اس زمانے میں شاعری تکلف و بناوٹ اور مبالغے سے بھری ہوئی تھی۔لیکن حالؔی نے سادگی اصلیت اور جوش کو شاعری کے لئے ضروری قرار دیا اور اُردو شاعری کو سمجھنے کے لئے چند اصول مقرر کئے۔اس طرح ترقی پسند تنقید کی جھلک بھی سب سے پہلے والی کے یہاں نظر آتی ہے۔

۲) شبلی نعمانی :

مولانا الطاف حسین حالؔی کے بعد اُردو کے دوسرے بڑے نقاد شبلی نعمانی ہیں۔حالؔی اور شبلؔی کے تنقیدی نظریات میں فرق ہے۔حالی ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ان کی نظر میں شاعری کا اصل مقصد زندگی کو سنوارنا اور اخلاق کی اصلاح کرنا ہے۔لیکن شبلی ادب برائے ادکے قائل ہیں۔ان کے نزدیک شاعری کا اصل مقصد سامع اور قاری کو ندرت وخوشی عطا کرنا ہے۔شبلی کی نظر اس حقیقت پر رہتی ہے کہ فنکار نے فن کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کیا۔شبلؔی کے ان ہی نظریات کی بدولت ان کا شمار جمالیاتی نقادوں میں ہوتا ہے۔

شبلی کے نزدیک شعر، دو چیزوں سے مل کر وجود میں آتا ہے۔ایک وہ بات جو شعر میں کہی گئی۔دوسرا وہ الفاظ جن کے ذریعے وہ ابتداء کی گئی۔بہر حال شبلی نے بھی اپنی تصانیف کے ذریعے اور اپنے تنقیدی خیالات کے ذریعے اُردو ادب میں اچھا خاصا اضافہ کیا۔شبلؔی کی تنقیدی تصانیف میں موازنہ انیس و دبیر اور شعرالعجم کا شمار ہوتا ہے۔شعرالعجم کی پانچ جلدیں ہیں۔جن میں سے زیادہ اہم چوتھی جلد ہے۔شبلی کے تنقید خیالات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

یوں توش کی تنقید میں عملی تنقید موجود ہے۔لیکن شعرالعجم کا تنقدی جائزہ لینے پر اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ شعرالعجم میں عملی تنقید سے زیادہ تشریح کا پہلو ہے۔اس کتاب میں شبلؔی نے مختلف شعراء کا ذکر کرتے ہوئے ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔ساتھ ہی ساتھ مختلف اصنافِ سخن مثلاً مرثیہ، مثنوی، غزل اور قصیدے پر بھی اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

شبلؔی کے تنقیدی شعور کی نشوونما میں ایک طرف تو حالؔی کی طرح خارجی حالات کا عمل و دخل ہے۔دوسری طرف خود شبلؔی کی ذاتی صلاحتیں مختلف علوم وفنون کے مطالعے نے بھی ان کے تنقیدی شعور کو جلا بخشی۔شبلؔی کے تنقیدی شعور کی نشوونما میں عربی، ادبی اور نقادوں کا بھی بڑا عمل ودخل ہے۔ساتھ ہی ساتھ مغربی ادب کے مطالعے سے بھی ان کے تنقیدی شعور کو جلا بخشی۔

شبلؔی کے تنقیدی نظریات ان کے غور وفکر کا نتیجہ ہیں، حالؔی کی طرح شبلؔی بھی شاعری اور سوسائٹی کی تبدیلی کو لازم قرار دیتے

ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ خدا نے انسان کو دو قوتیں عطا کی ہیں۔ایک ادراک ((فہم) اور دوسرا احساس (اثر قبول کرنا)۔یہ دونوں قوتیں انسان کے سارے افعال کا سرچشمہ ہیں۔ادراک کا کام ہے چیزوں کا پتہ لگانا،ان پر غور وفکر کرنا اور مسائل کو حل کرنا ہے۔سارے علوم وفنون،ایجادات وانکشافات اور تحقیقات کا تعلق انسان کی اسی قوت سے ہے۔احساس کا مفہوم ہے۔اثر قبول کرنا۔یعنی انسان مختلف واقعات سے مختلف طور پر متاثر ہوتا ہے۔مثلاً غم کی حالت میں اسے صدمہ محسوس ہوتا ہے۔خوشی میں سرور اور حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے۔شبلی احساس کو شاعری کا دوسرا نام کہتے ہیں۔ان کے خیال میں احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے۔حالی کی طرح شبلی بھی اس بات سے متفق ہیں کہ جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور اس کو تحریک میں لائے وہ شعر ہے۔مفہوم یہ ہے کہ شاعری کے لئے جذبات کا ہونا بے حد ضروری ہے۔

عربی علماء کے دو گروہ ہیں۔ایک لفظ کو اہمیت دیتا ہے۔اور دوسرا معنی کو۔شبلی شاعری میں معنی سے زیادہ الفاظ کو اہمیت دیتے ہیں۔مضمون تو سب پیدا کر سکتے ہیں۔لیکن شاعر کا معیار کمال یہ ہے کہ وہ مضمون کو کن لفظوں میں باندھتا ہے۔اس کی بندش کیسی ہے، شبلی کا کہنا ہے کہ مضمون کتنا ہی نازک اور بلند کیوں نہ ہو،موزوں الفاظ نہ ہوں تو شعر میں اثر پیدا نہیں ہوتا۔شاعری میں سادگی سے زیادہ مینا کاری کے قائل ہے۔تشبیہہ واستعارہ ان کی نظر میں شعر کے زیور ہیں۔شبلی فصاحت وبلاغت کو بھی شاعری کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ان کے نزدیک شاعری دو چیزوں کا نام ہے۔محاکات اور تخیل۔محاکات سے شبلی کی مراد یہ ہے کہ کسی چیز یا حالت کا اس طرح بیان کرنا کہ اس شئے یا حالت کی تصویر آنکھوں میں گھوم جائے۔شبلی کی نظر میں تخیل محاکات سے زیادہ اہم ہے تخیل کی بدولت ہی محاکات میں جان آتی ہے۔تخیل وہ قوت ہے جو ان چیزوں کو ہمارے سامنے لا کر کھڑا کر دیتی ہے جو ہمارے آنکھوں سے اوجھل ہے۔ قوت تخیل ایک چیز کو (100) سو دفعہ دیکھتی ہے۔اور ہر دفعہ اسے اس یز میں نیا کرشمہ دکھائی دیتا ہے۔مثال کے طور پر پھول جس میں شاعر کو کبھی خدا کا جلوہ نظر آتا ہے تو کبھی محبوب کے لب وعارض کی خوشبو آتی ہے۔کبھی اس میں عاشق کے چاک گریباں کی تصویر نظر آتی ہے۔اور کبھی یہ پھول ہی دنیا کی بے ثباتی کا استعارہ بن جاتا ہے۔

شبلی کا کہنا ہے کہ رنگوں کی بنائی ہوئی تصویر کے مقابلے میں شعری تصویر زیادہ موثر ہوتی ہے۔مصور کسی ٹھہری ہوئی چیز کی تصویر کھنچتا ہے اور شاعر چلتی پھرتی شئے کی تصویر کھنچنے پر قدرت رکھتا ہے۔مصور انسانی جذبات واحساسات مثلاً: خوشی، رنج، فکر، وغیرہ کسی بھی جذبے کی تصویر کشی نہیں کر سکتا مگر شاعر لفظوں کے ذریعے ان کی بہترین تصویر کشی کر سکتا ہے۔شبلی کہتے ہیں کہ مصور کسی چیز کے طول وعرض اور اس کی گہرائی دکھانے سے قاصر ہے۔لیکن شاعر الفاظ کے ذریعے یہ کمال دکھا سکتا ہے۔شبلی عام مصوری اور شاعرانہ مصوری میں فرق بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ مصور جزئیات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔لیکن شاعر کسی چیز کے نمایاں پہلو کو جو ہمارے دل پر

گہرا اثر ڈالتے ہیں اسے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

شبلی کے تنقیدی نظریات کا جائزہ لینے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ان کی تنقید میں چند کامیاں بھی ہیں۔ مثلاً اپنے تنقیدی نظریات کو پیش کرتے ہوئے شبلی نے فلسفیانہ بحث کی۔ لیکن سماجی پہلوؤں پر بہت کم توجہ دی ہے۔ شبلی کا یہ خیال غلط ہے کہ اصل شاعر وہ ہے جسے سامعین سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ ان کا یہ خیال بھی غلط ہے کہ انسان کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے وہ شعر ہوتا ہے۔ انھوں نے شعر کی معنوی خوبیوں کے مقابلے میں ظاہری خوبیوں کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔

ان خامیوں کے باوجود بھی شبلی اُردو تنقید میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اپنی نظریاتی تنقید کے ذریعے انہوں نے عوام کے ان شعر کا صحیح ذوق اور شعر کہنے کا یہ صحیح شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ شبلی نے شعر کی اہمیت کا دوسرے فنون لطیفہ کے مقابلے میں اس کی برتری سماجی زندگی میں اس کی ضرورت اس کی ماہیئت اور اچھائی اور برائی میں تمیز ان تمام باتوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ نظریاتی تنقید کے ساتھ ساتھ شبلی نے عملی تنقید کا بھی خاصا ذخیرہ چھوڑا ہے۔

۳) محمد حسین آزاد :

اُردو تنقید کے نظریہ سازوں میں ایک نام ''مولوی محمد حُسین آزاد'' کا ہے۔ تنقید کے بنیادی مسائل کے بارے میں یوں تو انہوں نے کم لکھا ہے مگر سر سے پہلے لکھا اس لئے اولیت کا تاج ان ہی کے سر پر رکھنا چاہیے۔ مولانا محمد حسین آزاد ایک بے مثل انشاء پرداز تمثیل نگار، خاکہ نگار، سیرت نگار، نقاد اور ایک شاعر بھی ہیں۔ ''آب حیات'' کے ذریعے ہم محمد حسین آزاد کو نقاد شاعر انشاء پرداز اور تاریخ گو کی حیثیت سے دیکھ سکتے ہیں۔ ''دریائے اکبری'' انشائیہ نگاری کی تاریخ کا عمدہ نمونہ ہے۔ ''سخن دانِ فارس نگارستان'' اور ''فارستان'' ان کی نمائندہ تصانیف ہیں۔ ''نیرنگ خیال'' میں تمثیلی افسانے ہیں مولانا حالؔی کی مقدمہ شعر و شاعری سے پہلے ۱۸۶۷ء میں آزاد نے ایک مشاعرے میں شعر و شاعری سے متعلق ایک لیکچر دیا تھا اور شاعری سے متعلق کئی اہم مسائل پر روشنی ڈالی تھی۔ اس لیکچر کا عنوان تھا'' نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات'' اس زمانے کے لحاظ سے آزاد کا یہ لیکچر بہت ہی اہم تھا لیکن یہ کوئی مستقل کتاب نہ تھی اور اس میں جو تنقیدی خیالات واضح ہو جاتے ہیں۔ ان کے خیالات میں مشرق و مغرب دونوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مشرقی ادبیات کا مطالعہ انھوں نے براہ راست کیا تھا۔ اور مغربی نظریات سے بلا واسطہ فیض اٹھایا تھا۔ آزاد کی تصانیف میں جدید تنقید کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکچر کے بعد ان کی مستقل تصنیف ''آب حیات'' ہے۔

آب حیات آزاد کی تصانیف میں سے زیادہ شہرت رکھنے والی تصنیف ہے۔ اس کی ٹیکنیک تذکروں سے بالکل ہٹ کر ہے۔ اس کتاب میں آزاد نے شاعری کے مختلف موضوعات پر تبصرہ کیا ہے۔ شعراء کا ذکر بہ اعتبار حروف تہجی نہیں کیا ہے۔ شعراء کے کلام پر

تنقید کی ہے اور تذکروں کے مقابلے میں شعراء کے حالات کو بھی کافی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ''دیوان ذوق'' کا جو مقدمہ آزاد نے لکھا ہے اور اس میں ذوق کے کلام پر جس طرح روشنی ڈالی ہے اور اپنی رائے پیش کی ہے اس سے ان کے تنقیدی خیالات کا پتہ چلتا ہے ان تنقیدی خدمات کو دیکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آزاد صرف ایک تذکرہ نگار نہیں تھے۔

آزاد کے تنقیدی شعور کی نشو ونما میں بھی اس ماحول کا عمل و دخل ہے جو شبلی اور حالی سے تعلق رکھتا ہے نئی نئی تحریکوں اور خاص طور سے ادب کی تحریکوں نے محمد حُسین آزاد کو بے حد متاثر کیا تھا۔ مغربی ادب کے مطالعے نے بھی آزاد کے تنقیدی شعور کو جلا بخشی ہے ان کے تنقیدی شعور کی نشو ونما میں ان کے افتادِ طبع اور ذہنی رجحان کا بڑا دخل ہے۔

تنقیدی نظریات سے متعلق آزاد نے کوئی مستقل کتاب نہیں چھوڑی ہے۔ صرف وہی ایک لیکچر ہے جو ۱۸۶۷ء میں دیا تھا۔ ان کے نزدیک شاعری کے لئے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔

۱) خیال

۲) شعر کے لئے موضوعات

۳) اندازِ بیان

انگریزی ادب کی بدولت ان کے خیالات میں زبردست تبدیلی آ گئی۔ شاعری کے قدیم گھے پیٹے موضوعات اور اصولوں سے ہٹ کر گروہ کچھ نئی موضوعات اور اصول اُردو شاعری میں داخل کرنے کے لئے بے چین تھے۔ وہ اُردو شاعری اور ادب کی اصطلاح انگریزی ادب کے اصول کو لے کر کرنا چاہتے تھے۔ انگریزی ادب کی بدولت ہی وہ شعر کی افادی حیثیت کے قائل ہو گئے تھے۔ مولانا حالی اور شبلی کی طرح آزاد کا بھی یہی خیال ہے کہ حالات و واقعات کی تبدیلی کے ساتھ شعر و ادب بھی بدلتا ہے۔ آزاد کے تنقیدی نظریات حالی اور شبلی کی طرح آزاد کا بھی یہی خیال ہے کہ حالات و واقعات کی تبدیلی کے ساتھ شعر و ادب بھی بدلتا ہے۔ آزاد کے تنقیدی نظریات حالی اور شبلی کے جیسے ہونے کے باوجود بھی ان کو حالی اور شبلی کے جیسے ہونے کے باوجود بھی ان کو حالی اور شبلی کے برابر کا مقام نہیں دیا جا سکتا ہے۔

آزاد کے یہاں عملی تنقید کے نمونے '' آب حیات''، '' سخن دان فارس'' اور '' مقدمۂ دیوان ذوق'' میں نظر آتے ہیں۔ '' نگارستان و فارستان''، شبلی کے شعر العجم کی طرز پر لکھی ہوئی تصنیف ہیں۔ سخن دان فارس کو عام طور سے تقابلی لسانیاتی کتاب سمجھا جاتا ہے جبکہ یہ بات صرف اس کے پہلے حصے پر صادق آتی ہے۔ دوسرے حصّے میں لیکچر ہیں ان میں سے بعض لیکچر مکمل تنقیدی رائے پیش کی ہے۔ وہ بعض جگہ نہایت مختصر ہے جس کی وجہ سے شاعروں کے کلام پر روشنی نہیں پڑتی۔ اور پڑھنے والوں کو ایک قسم کی تشنگی محسوس

ہوتی ہے۔

آزاد نے شاعری سے متعلق جو رائے پیش کی ہے۔اس میں یکسانیت نہیں ہے۔مثلاً شعر گوئی ان کے نزدیک کوئی شعوری عمل نہیں تھا بلکہ وہ اسے کسی غیبی قوت کا رفرمائی سمجھتے تھے۔مشرقی نظر وادب کی بدولت وشعر گو خیالی باتوں کا مجموعہ اور گلزار فصاحت کا پھول بتاتے ہیں۔سرسیّد کے خیالات سے آشنائی اور مغربی نظریات سے آگاہی کی بدولت آزاد افادیت اور مقصدیت کے قائل ہوگئے۔تو شعر سے متعلق ان کا نظریہ بدل گیا وہ شعر کو علم کا عطر کہتے ہیں۔ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ شعر وقوت ہے جو قوموں کی قسمت کو پلٹ دے۔آزاد اُردو شعراء کو یہ بھی مشورہ دیتے ہیں کہ عربی و فارسی زبان کی بجائے ہندی زبان کی طرف توجہ دیں اور ہندی شاعری کی طرح بے جا مبالغہ آرائی سے دامن بچاتے ہوئے جذبات کی سچی تصویر کھینچ سکیں اُردو شعراء سے انہیں یہ بھی شکایت ہے کہ نرگس، نسرین اور سرو شمشاد جیسے ان دیکھے پھولوں اور درختوں کے نام تو انہیں ازبر ہیں مگر بیلا، موتیا، چمپا، چمیلی اور گلاب سے وہ بے خبر ہیں حالانکہ یہ پھول ان کے اپنے آنگن میں مہکتے ہیں جیحوں، سیحوں اور دجلہ اور فرات کا ذکر تو یہ کرتے ہیں لیکن گنگا، جمنا کے نام سے انہیں یاد نہیں آتے۔

کلیم الدین احمد نے آزاد سے متعلق اس تنقیدی خیال کا اظہار کیا۔آزاد کا تنقید کا مادہ بالکل نہیں تھا کلیم الدین احمد کی یہ رائے تو انتہا پسندانہ ہے۔مگر اتنا ضرور ہے کہ آزاد کی عملی تنقید نقائص سے خالی نہیں آزاد نکتہ دان اور سخن فہم تھے تنقید کی زبردست صلاحیت بھی رکھتے تھے۔مگر دو چیزوں نے ان کی تنقیدی صلاحیت کو زبردست نقصان پہنچایا ایک تھا ان کا تعصب وطرف داری دوسرا ان کی انشاء پردازی۔ان کی طرف داری یہ تھی کہ ''آب حیات'' کے پہلے ایڈیشن میں انہوں نے مومنؔ کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا مگر دوسرے ایڈیشن میں آخر نہیں شامل کرنا ہی پڑا۔ظاہر ہے کہ اہل نظر نے اس ناانصافی پر آزاد کو گرفت میں لیا ہوگا۔غالبؔ کی آزاد کے استاد ذوق سے چشمک تھی چونکہ غالبؔ اپنی عملی لیاقت کی وجہ سے بے حد شہرت رکھتے تھے اس لئے غالبؔ کو نظر انداز کرنا ان کے لئے آسان نہیں تھا۔اس لیے غالبؔ کا ذکر تو انہوں نے کیا اور اس طرح کیا کہ پہلی نظر میں تو یہ تعریف معلوم ہوتی ہے مگر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی شاعری کے عیب گنا رہے ہیں۔ذوق کا رنگ سیاہ تھا انہیں نو دفعہ چیچک نکلی تھی چہرے پر داغ داغ تھے مگر فرماتے ہیں کہ یہ داغ کچھ ایسی موروثی سے واقع ہوئے تھے کہ چمکتے تھے اور بہار دکھاتے تھے یہ تھا عقیدت کا حال مگر تنقید میں اس کی گنجائش نہیں۔یہاں تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا ہوتا ہے۔آزاد اکثر موقعوں پر انصاف کرنے میں ناکام رہے۔

آزاد کو انشاء پردرازی میں وہ کمال حاصل ہے کہ آج تک کوئی ان کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکا۔ان کی انشاء پردازی سے متعلق علامہ شبلیؔ نے فرمایا تھا۔کہ وہ لگ گیا بھی ہانک دیئے تو وحی معلوم ہوتی ہے۔تنقیدی غلطیوں کے ساتھ ساتھ بعض تحقیقی غلطیاں بھی

آزادی سے ہوئی ہیں انہوں نے آب حیات میں چند ایسے واقعات بھی قلمبند کئے ہیں جنہیں تحقیق نے جھٹلا دیا ان خامیوں اور کے باوجود بھی آزاد اور تنقید میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔

۳۔۲۹ : خود جانچنے کے سوالات :

۱۔ مولانا محمد حُسین آزاد کے روایتی تنقیدی پر اظہار خیال کیجئے۔

۲۔ مولانا الطاف حسین حالؔی کی تنقیدی نگاری پر اظہار خیال کیجئے۔

۳۔ مولانا شبلی نعمانی کی تنقید نگاری پر خاکہ پیش کیجئے۔

۳۔۳۰ : اس اکائی کے اہم سوالات

☆ اُردو ادب میں روایتی تنقید کا تاریخی خاکہ پیش کیجئے۔

☆ حالؔی کی تنقید کا اہم مقصد واضح کیجئے۔

☆ شبلی نعمانی بہ حیثیت نقاد کا مقام و مرتبہ متعین کیجئے۔

۳۔۳۱ : فرہنگ

قناعت ۔۔۔۔ قانع کرنا

روایت ۔۔۔۔ رواج

شعور ۔۔۔۔ سمجھ

قوت ۔۔۔۔ قوت کا خیال کیا گیا۔خیال میں لانے کی قوت

۳۔۳۲ : سفارش کردہ کتب:

☆ تذکرہ حالؔی ۔۔۔ اسماعیل

☆ تنقید شعرالعجم ۔۔۔ پروفیسر محمود شیرانی

☆ تاریخ و تنقید ادبیات اُردو ۔۔۔ حامد حسن قادری

Unit-4

اکائی-4-

تنقید کے دبستان

اکائی۔ ۴ :

اکائی کے اجزاء

۴۔۳۳ : مقصد

۴ ۳۴: تمہید

۴۔۳۵ : تنقید کے دبستان

۴۔۳۶: تاثراتی۔۔جمالیاتی۔۔معروضی۔۔ترقی پسند۔نفسیاتی۔۔سائنٹفک۔۔نقالی۔

۴۔۳۷ : خود جانچنے کے سوالات

۳۸۔ : اس اکائی کے اہم سوالات

۳۹۔: فرہنگ

۴۰۔ : سفارش کردہ کتابیں

۱۳۔ : مقصد

پچھلی اکائی میں ہم نے اُردو کی روایتی تنقید سے واقف ہوئے ہیں اب تنقید کے دبستان کی معلومات ہم فراہم کریں گے۔

۳۴۔ : تمہید

اب اس اکائی میں تنقیدی دبستان کونسے ہیں۔تاثراتی تنقید۔جمالیاتی تنقید۔معروضی تنقید۔ترقی پسند تنقید۔ نفسیاتی تنقید۔سائنٹفک تنقیدی اور تقابلی تنقید کی معلومات فراہم کرینگے۔

۳۵ ۔۴ : تنقید کے دبستان:

اُردو ادبی تنقید میں سماجی تنقید کا اہم رجحان ہے۔جس کی ابتداء حالی کے افادیت کے نظریے سے ہوئی۔جس کی پرورش ، مارکس اور اینجلز کے فلسفیانہ نظریات سے ہوئی جس میں انسان ، ادیب اور ادب کے سماجی رشتے ، سماجی رشتے کے عصری تقاضے، طبقاتی کشمکش، تاریخی جلدیت اور جلدیاتی معدیت کے تحت فن اور فن کی خوبیوں کو پرکھا گیا اور ادب کے اقدار کے تعین کی کوشش کی گئی۔ یہ ایک اہم رجحان تھا جو بہت تیزی سے پھیلا۔ کچھ ملکی اور بین الاقوامی تاریخی سیاسی حالات کے پھیلنے میں معاون ہوئے اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے ایک دبستان کی صورت اختیار کرلی۔ جیسے کسی نے مارکسی یا ترقی پسند تنقید، کسی نے سماجی یا عمرانی تنقید کا نام دیا۔اس طرح روایتی یا کلاسکی تنقید، جمالیاتی ، رومانی ، تاثراتی اور نفسیاتی تنقید میں تقسیم ہوئے۔

۳۶۔۴ : تاثراتی تنقید:

جمالیاتی تنقید کی طرح تاثراتی تنقید بھی تاثرات کو ہمیت دی جاتی ہے۔اس لئے بعض لوگ جمالیاتی و تاثراتی تنقید کو ایک ہی چیز خیال کرتے ہیں۔لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔دونوں میں کچھ خصوصیات مشترک ہیں۔مگر دونوں کا طریقہ کار جداگانہ ہے۔ جمالیاتی تنقید کسی فن پارے میں صرف تاثرات ہی کو اہمیت نہیں دیتی بلکہ ان عناصر کی تلاش بھی کرتی ہے جنہوں نے اسے دلکشی رعنائی عطا کی۔تاثراتی تنقید فن پارے سے حاصل ہونے والی مسرت ولطف کو اہم تصور کرتی ہے وہ موضوع سے زیادہ طریقہ اظہار کو اہمیت دیتی ہے۔ تاثراتی تنقید ادب کا صرف ایک رُخ دیکھتی ہے وہ یہ دیکھتی ہے کہ کسی فن پارے نے قاری کے ذہن پر کیا اثرات مرتب کئے۔اگر خوشگوار اثر پڑتا ہے تو یقیناً وہ فن پارہ قابل تعریف ہے۔

تاثراتی نقادوں کا یہ استدلال (دلیل) ہے کہ ادب تاثرات کے فنی اظہار کا نام ہے اور اگر ادب سے جذبات و تاثرات کو علیحدہ کرلیا جائے تو اس کا حسن اور جاذبیت باقی نہ رہے گی یہ نقاد فن کے مقصدی و افادی (فائدے) پہلو کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ خیال کی گہرائی اور معنی آفرینی کو بھی قابل توجہ نہیں سمجھتے بلکہ صرف اظہار پر ان کی توجہ مرکز رہتی ہے تاثراتی نقاد اپنی تنقید میں تشبیہات و استعارات سے کام لیتے ہیں یہ ادب کو سماجی ، معاشی قدروں اور اخلاقیات کا تابع نہیں سمجھتے بلکہ ان کا کہنا ہے کہ ادب کا اصل مقصد انسان کو مسرت پہنچانا ہے۔نقاد کا کام سیاہ وسفید اخلاقی وغیر اخلاقی ، افادی وغیر افادی ادب میں تمیز کرنا نہیں ہے۔ یہ فلسفی کا منصب ہے تاثراتی تنقید کے اس طرح کے غلط رویے کی وجہ سے ہی کلیم الدین احمد نے تاثراتی تنقید کو غیر ذمہ دارانہ تنقید قرار دیا ہے۔

تاثراتی تنقید کی بنیاد انیسویں صدی کے رومانی اسکول کے ادبی اصولوں پر قائم ہے۔اس دبستان کے ماننے والے جذباتی ہیجان کو تنقید کا محرک سمجھتے ہیں۔یعنی کوئی نظم جذبات میں جو طلاطم اور ہل چل پیدا کرتے ہے تو اس کے اظہار کا نام تنقید ہے۔تاثراتی تنقید پر مختلف اعتراضات کیے گئے ہیں۔

۱) تاثراتی تنقید میں تنقید کا معیار (درجہ) ذاتی پسند اور شخصی ناپسندگی ہوتا ہے۔

۲) اس میں انفرادیت کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

۳) تاثراتی تنقید معنی پر طرزِ اظہار کو خیال پر اسلوب کو ترجیح دیتی ہے۔

۴) تاثراتی تنقید میں بہت زیادہ داخلیت پائی جاتی ہے۔

۵) تاثراتی تنقید ادب میں اخلاق کی مداخلت کو پسند نہیں کرتی۔

تاثراتی تنقید کے اہم نقاد والٹر پیٹر، اسپین گارن، اسکر واوئلڈ کروچے ہیں۔ یہ نقاد شاعر کو مقصد اور نظریے کا بوجھ برداشت کرنے کے قابل نہیں سمجھتے۔وہ اسے اخلاق، مذہب، سماج اور سیاست سے بے نیاز قرار دیتے ہین۔مندرجہ ذیل بالا نقادوں میں اسپین گارن کا نام س سے زیادہ نمایاں ہے۔

اسپین گارن:

اسپین گارن کا کہنا ہے کہ شعر میں جو بات کہی جارہی ہے وہ سچ ہے یا جھوٹ اچھی ہے یا بُری یہ دیکھنا اور اس پر رائے دینا نقاد کا کام نہیں بلکہ یہ فلسفی کی ذمہ داری ہے۔نقاد کی پوری توجہ ہیئت پر رہنی چاہیے یعنی اس کا کام یہ دیکھنا ہے کہ بات کو کس انداز سے کہا گیا اور اس سے پڑھنے والے کو مسرت حاصل ہوئی یا نہیں اسپین گارن کا یہ بھی کہنا ہے کہ شاعری اخلاق کو سدھارنے کا آلہ نہیں، جی کو خوش کرنے کا ذریعہ ہے۔

والٹر پیٹر:

والٹر پیٹر کا کہنا ہے کہ کسی ادبی تخلیق کو پرکھنے کا پیمانہ نہ صرف یہ ہوسکتا ہے کہ اس کے مطالعے سے ذہن پر کسی قسم کا اثر ہو۔

کروچے:

کروچے کہتا ہے کہ شاعر شعر کا مضمون سوچ سمجھ کر منتخب نہیں کرتا۔ بلکہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرنا شاعر کی ذمہ داری نہیں ہے اس کی رائے ہے کہ شاعر اپنی تخلیق کو خوبصورت بنا سکا تو وہ کامیاب ہوگیا اور تخلیق بدصورت رہی تو شاعر ناکام رہا۔

اُردو تنقید پر روز اول سے ہی تاثراتی تنقید کا غلبہ رہا ہے۔شاعروں کی واہ واہ اور سبحان اللہ، تاثرات تنقید ہی کی ایک شکل ہے۔جس کا آج تک رواج ہے اس تنقید کی خامیاں اب پوری طرح نمایاں ہوچکی ہیں۔لیکن آج بھی کہیں کہیں اس کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔اُردو تنقید کے اولین نمونے شعرائے اُردو کے تذکروں میں ملتے ہیں اُردو تنقید کے اولین نمونے شعرائے اُردو کے تذکروں میں ملتے ہیں۔ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تنقید یا تو عروضی ہے تاثراتی تذکروں کے بعد جن نقادوں نے تاثراتی تنقید کو اپنایا ہے ان میں محمد حُسین آزاد، شبلی نعمانی، مہدی افادی، عبدالرحمٰن بجنوری، نیاز فتح پوری، فراق گورکھپوری، محمد حسین عسکری، رشید احمد صدیقی اور خورشید الاسلام قابل ذکر ہیں۔ان میں بعض کلیتاً تاثراتی نقاد ہیں اور بعض کے یہاں کہیں کہیں تاثراتی تنقید کے نمونے مل جاتے ہیں۔

محمد حسین آزاد سرسیّد کی تحریک سے بے حد متاثر تھے۔ان کی خواہش تھی کہ بدلے ہوئے حالات میں شعر و ادب میں انقلاب آئے۔وہ ادب کے مقصدیت کے قائل تھے مگر عملی تنقید میں عموماً تاثراتی نقاد کا منصب (درجہ) اختیار کر لیتے ہیں۔علامہ شبلی کا بھی شمار اُردو تنقید کے بانیوں میں ہوتا ہے۔انہوں نے مشرقی اور مغربی دونوں تنقیدوں سے استفادہ کیا ہے۔فن تنقید سے متعلق انھوں نے بہت سی فکر انگریز باتیں کہی ہیں۔مگر ان کی تحریروں سے بھی تاثراتی تنقید کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔شبلی نے جو تعریف کی ہے اس سے ان کے تاثراتی رجحان کا پتہ چلتا ہے کہتے ہیں ''جو جذبات الفاظ کے ذریعے ادا ہوں وہ شعر ہے'' شبلی شعر کی تعریف یوں بھی کرتے ہیں جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور ان کو تحریک میں لائے وہ شعر ہے۔

مہدی فادی کی تصنیف ''افادیت مہدی تاثراتی تنقیدی کا عمدہ نمونہ ہے'' نیاز فتح پوری یوں تو جمالیاتی نقاد ہیں۔لیکن ان کی تحریروں میں کہیں کہیں صرف تاثرات کی کارفرمائی نظر آتی ہے جس کی مثال ان کے یہ جملے ہیں۔ہم شفق کی رنگینیوں سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں یہ بھی شعر ہے ہم قوس قضا کو دیکھتے ہیں بے اختیار کلماتِ حسین ہمارے زبان سے نکل جاتے ہیں۔یہ بھی شعر ہے'' فراق گورکھپوری، عبدالرحمٰن بجنوری، رشید احمد صدیقی، خورشید الاسلام وغیرہ کی تحریروں میں بھی تاثراتی تنقید کی جھلک نظر آتی ہے غرض ہر نقاد کی تحریر میں کہیں تاثراتی تنقید نظر آتی ہے مگر یہاں س کا ذکر کرنا ناممکن ہے۔

جمالیات ایک فلسفیانہ اصطلاح ہے۔جسے انگریزی میں (Aesthetical) کہتے ہیں۔اس اصطلاح کو سب سے پہلے بام کارٹن نے وضع کیا تھا۔مجنوں گورکھپوری کا کہنا ہے کہ جس انگریزی لفظ کے جواب میں اُردو لفظ گھڑا گیا۔وہ اس کا صحیح مترادف نہیں کیونکہ (Aesthetical) کا موضوع حسن اور فنون لطیفہ کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔اس رعایت سے عربی، فارسی اور اُردو میں اس کا ترجمہ جمالیات کیا گیا۔جمالیات کو ایک سائنس بھی کہا جاتا ہے۔جو منطق (logic) اور اخلاقیات کی طرح اقدار ہے بحث کرتی

ہے۔ جمالیات میں حسن کا تصور بدلتا رہتا ہے۔اس لئے ادب میں بھی تنقید کا انداز بولتا ہے۔لفظ جمالیات یونان کی جس اصطلاح سے مشتق ہے۔اس کے معنی فہم اورادراک کے ہیں۔ جمالیات اپنے مخصوص معنوں میں فلسفے کی ایک شاخ ہے جوایک معیاری سائنس کہلاتی ہے۔ جمالیات کے موضوع حسن ہے۔ ہرانسان میں حسن کا احساس فطری طور پر موجود ہوتا ہے۔اس لئے ہرخوبصورت چیز کو دیکھ کراسے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ہرعہد میں مختلف مفکرین نے حسن سے متعلق کچھ نظریے قائم کیے ہیں۔بعض حسن کو خارجی حقیقت تصور کرتے ہیں۔فنون لطیفہ کے حسن سے گہرا تعلق ہے۔ ہم حسن کے بغیر فنون لطیفہ کا تصور نہیں کر سکتے۔ سنگ تراشی میں کشش،مصوری میں رنگ،موسیقی میں تال اورشعر میں آہنگ وتوازن ان سب کا تعلق احساس جمال سے ہے۔ جمالیاتی تنقید حسن کا ایک مخصوص تصور رکھتی ہے۔اوراسی تصور کی مدد سے وہ فنکاروں کو پرکھتی ہےاوران کی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے۔

ابتداء میں ماہیئت اورحسن کی تلاش فلسفے کے موضوع رہے ہیں۔ جمالیاتی تنقید پرمختلف مغربی نقادوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

(۱) **سقراط:** سقراط کے نزدیک حسن نیکی ہےاور نیکی صداقت ہے۔

(۲) **افلاطون:** افلاطون کا کہنا ہے۔علوم،اعمال اورقوانین میں حسن ہوتا ہے۔اس حقیقت کی وضاحت اس نے اس طرح کی ہے کہ ''حسن پیش کش میں نہیں ہوتا بلکہ جو چیز پیش کی جاری ہےاس میں بھی ہوتا ہے۔''

(۳) **سارتر:** مفکر سارتر کا کہنا ہے کہ شعرا گرحسن مجسم ہےتو تنقید نگار کا یہ فرض ہے کہ شعر میں حسن کے جتنے بھی عناصر ہیں ان کا پتہ لگائے اورتجزیہ کرے جوتنقیداس ذمہ داری کوقبول کرتی ہے۔وہ جمالیاتی تنقید ہے۔

(۴) **بام کارٹن:** جمالیاتی تنقید کے صحیح معنوں میں آغاز بام کارٹن سے ہوا۔ بام کارٹن کے نزدیک حسین اورحقیقت ایک ہی شئے کے دونام ہیں۔وہ کہتا ہے کہ جس چیز کا علم ہمیں عقل کے ذریعے ہوتا ہے۔وہ حقیقت ہےاور جس کا علم ہمیں احساس کے ذریعے ہوتا ہے۔وہ حسن ہے۔''

(۵) **ہیگل:** ہیگل نے اس خیال کو غلط قرار دیا کہ شاعری میں واحدنیت کے سوا،کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔اس کا خیال ہے کہ غوروفکر کے بغیر کامیاب شاہکار وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔اس کی مثال شیکسپیئراورعلامہ اقبال ہس۔شیکسپیئر نے اپنے ڈرامے کے مکالموں میں اوراقبال نے اپنے مصرعوں کی ترتیب والفاظ میں کئی کئی مرتبہ ردوبدل کیا ہے۔

(۶) **کولرج :** کولرج کے نزدیک الفاظ کی بہترین ترتیب نثر ہےاور بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب شعر ہے۔کہا گیا ہے کہ نثر ایسی ہونی چاہیے جسے بلندآواز سے پڑھا جاسکے۔جبکہ اس وقت زیادہ موثر ہوگا۔جب اسے گایا بھی جاسکے۔

حسن سے متعلق مختلف مفکرین نے مختلف باتیں کہی ہیں کوئی کہتا ہے کہ ''حسن تناسب، ہم آہنگی، ترتیب و تنظیم کا کوئی نام ہے۔'' مگر اس خیال کی تردید اس طرح کی گئی ہے۔

آسمان میں بکھرے ہوئے بے ترتیب ستارے بھی حسین لگتے ہیں۔ افلاطون نے بہت پہلے ہ کہا ہے کہ حسین ایک نور ہے۔ جو توازن ہم آہنگی، ترتیب سے بالاتر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ خوبصورت رنگ وروشنی ہی حسن ہے۔

کسی کو سیدھی ترچھی اور لہری دار لکیروں میں حسن نظر آتا ہے۔ اس طرح کسی نے سادگی کو حسن کہا ہے۔ تو کسی نے صناعی کو اور کوئی یہ بھی کہتا ہے کہ وہ شہ حسین ہے۔ جو مفید ہے۔ اس خیال کی تردیگ اس مثال کے ذریعے کی گئی ہے۔ قلعہ جب کھنڈر بن جاتا ہے تو سیاحوں کے لئے اور زیادہ پرکشش بن جاتا ہے۔ حسن جمال اور جلال دونوں میں ہوتا ہے۔ مثلاً ننھے سے پھول کی دلکشی بھی ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے اور ہمالیہ کی عظمت ورفعت بھی ایک بحث یہ بھی ہے کہ حسن موضوع ہے۔ یا معروضی ہے، مطلب یہ ہے کہ کچھ حسن رخ لیلیٰ میں ہے اور رباقی چشم مجنوں میں بہرحال تمام نقاد اس بات سے متفق ہیں کہ حسن اور سیرت ایک چیز کے دو نام ہیں۔

اُردو میں جمالیات تنقید کا آغاز مشاعروں کے ذریعے ہوا۔ مشاعروں میں شعراء کے کلام پر داد دینے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی شعر کے فنی پہلو پر بھی روشنی ڈالی جاتی تھی لیکن اس زمانے میں زیادہ تر زور زبان و بیان پر دیا جاتا تھا۔ اُردو میں جمالیاتی تنقید کا باقاعدہ آغاز ہے۔ حسن آزاد اور مولانا شبلی نعمانی نے کیا۔ اس سلسلے میں مہدی افادی، عبدالرحمٰن بجنوری، نیاز فتح پوری، محمد حسن عسکری، اثر لکھنوی، فراق گورکھپوری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان بزرگوں نے ان وسائل کا پتہ لگانے کی کوشش ضرور کی جن سے شاعری میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ مگر دشواری یہ ہے کہ ان میں اکثر نقاد تنقید کرتے وقت جذبات کی رو میں بہہ گئے۔ اور ان کی تنقید میں تاثرات کا غلبہ پیدا ہوگیا۔

جمالیاتی تنقید کے بہترین نمونے نیاز فتح پوری کے یہاں ملتے ہیں۔ تذکرہ نگاروں سے نیاز فتح پوری تک جمالیاتی تنقید میں حسن زبان پر زیادہ توجہ دی گئی ہے اور خیال پر طرز ادا کو فوقیت دی گئی۔ نیاز فتح پوری اپنے تنقیدی خیال کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب میں کسی شاعر کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالتا ہوں تو اس سے بحث نہیں کرتا کہ اس کے جذبات کہتے ہیں بلکہ صرف یہ دیکھنا ہوں کہ جذبات کے اظہار میں کس اسلوب style of writing کو اختیار کیا گیا۔ اور وہ اپنے جذبات سامعین تک پہنچنے میں کامیا ہوا یا نہیں۔ بیان خواہ وہ حسن عشق کا ہو یا جیسے کی پن چکی کا اس سے غرض نہیں۔ دیکھنے کی چیز صرف یہ ہے کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ الفاظ سے ادا ہوتا ہے یا نہیں۔

ڈاکٹر صفدر حسین نے بھی لکھنوی تہذیب کے فریم میں لکھنو کی شاعری کے نقوش پیش کیے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے ''ولی سے

اقبال'' تک میں مختلف شاعروں کے جمالیاتی نقطہ نظر سے جائزہ لیا ہے۔مولانا صلاح الدین مرحوم نے اسلوب نگارش کا سہارا لے کر محمد حسین آزاد کی فنی خصوصیات کو دل نواز طرزِ بیان کے سہارے پیش کیا۔

جمالیاتی تنقید کا ایک اسلوب یہ رہا ہے کہ وہ فنکار کو اس کے ماحول سمیت اس طرح پیش کرتی ہے جیسے وہ ہمارے سامنے مشاعرے میں شعر پڑھ رہا ہو اور ہم اسے داد دے رہے ہوں۔ جمالیاتی تنقید نگاروں نے ہمیں سرف فن کے اصولوں سے ہی آگاہ نہیں کیا بلکہ فن کی زبان بھی سکھائی ہے۔

جدید تر عہد میں بلند پایہ نقادوں نے ادب کے مطالعے کے لئے سائنٹفک طریقہ اختیار کیا ہے۔انہوں نے شعر و ادب کو مختلف زاویوں سے دیکھنے اور پرکھنے کے لئے قوانین مرتب کئے ہیں۔مثلاً کلیم الدین، حمد کی نظر شعر میں حسن و فکر دونوں کو تلاش کرتی ہے۔آل احمد سرور کا کہنا ہے کہ ادب پہلے ادبی تقاضوں کو پورا کرے پھر اس کے بعد زندگی کی خدمات گزار ہو تو اس میں کوئی مضائقہ ہیں۔ پروفیسر سرور ادب کی ان قدروں کو اہمیت دیتے ہیں جو اسے ادبی اور آفاقی بناتی ہیں۔موجودہ زمانے میں جمالیاتی اسلوب کو آگے بڑھانے کی کوشش ڈاکٹر وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر قمر رئیس، خورشید الاسلام، محمد عقیل، مسعود حسن خان اور گوپی چند نارنگ نے کی۔ یہ نقاد ادب میں حسین قاری کی اہمیت کے قائل ہیں۔

اشتراکی تنقید (مارکسی تنقید):

مارکسی تنقید کا علمبردار جرمنی کا مشہور مفکر'' کارل مارکس'' ہے۔ ۱۸۶۷ء میں کارل مارکس نے ایک اعلان نامہ شائع کیا۔ جسمیں اس نے ساری دُنیا کے مزدوروں کو ایک ہونے اور غلامی کی زنجیریں توڑنے کی دعوت دی۔اس اعلان نامہ نے ساری دُنیا میں ایک آگ لگا دی اور اس طرح محنت کش طبقہ اپنا حق حاصل کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔مزدوروں کو انقلاب کا راستہ دکھانے والا پہلا ملک ''روس'' ہے جہاں ۱۹۱۷ء میں ''لینن'' کی رہنمائی میں مزدور تحریک کو کامیابی حاصل ہوئی اور زار بادشاہ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا حکومت کی باگ ڈور مزدور اور محنت کشوں کے ہاتھ میں آ گئی۔

کارل مارکس نے اپنی تصنیف ''سرمایہ'' میں بھی اس خیالات کو پیش کیا کہ انسان دو طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔ایک طرف سرمایہ دار ہیں اور دوسری طرف مزدور ایک طبقہ ظالم ہے دوسرا طبقہ مظلوم۔مزدور محنت کرتا ہے اور سرمایہ دار ان کی محنت کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔اور دولت اکٹھا کرتے ہیں۔ادب اور فن اپنے زمانے کی پیداوار ہوتا ہے۔ وہ اپنے ماحول کا آئینہ دار اور دولت اکٹھا کرتے ہیں۔ادب اور فن اپنے زمانے کی پیداوار ہوتا ہے۔وہ اپنے ماحول کا آئینہ ہوتا ہے۔فنکار اپنی تخلیق میں صرف وہی باتیں پیش نہیں کرتا یا صرف ان ہی حالات کا ذکر نہیں کرتا جو اس پر گذرتے ہیں۔ بلکہ وہ اپنے اطراف و اکناف کو اپنی تخلیق کے ذریعہ پیش کرتا ہے۔تا کہ پڑھنے والے کو یہ محسوس ہو کہ اس تصنیف میں جو باتیں پیش کی گئی ہیں۔وہ اس کی روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔اس کا مفہوم یہ

ہے کہ اشتراکی ادیب وشاعر کا موضوع اس کی اپنی ذاتی نجی، یعنی انفرادی زندگی نہیں بلکہ تمام عوام کی زندگی یا اجتماعی زندگی ہے مارکسی تنقید اس نظریے پر مبنی ہے۔ کہ دنیا کی ہر چیز کا دوسری چیز سے گہرا تعلق ہے۔ اور دنیا میں ہر وقت تغیرات و انقلابات رونما ہوتے ہیں۔ چونکہ انسان بھی اس دنیا کا ایک جزو ہے۔ اس لئے اس کی زندگی بھی تغیر پذیر ہے۔ انسانی زندگی فطری طور پر چند ضرورویات کی تابع ہوتی ہے۔ ان ضروریات میں سب سے اہم معاشی و اقتصادی ضرورت ہے۔ انسان کی بنیادی ضرورت غذا ہے۔ ہر وہ شئے جو انسان کی اس ضرورت کو پورا کرنے میں مدد کرے وہ مفید ہے۔ خواہ ادب میں ہی کیوں نہ ہو۔

ادب کا مقصد انسانی زندگی کو فروغ دیتا ہے اور انسانی زندگی کا گہرا تعلق بنیادی ضرروت سے ہے۔ چنانچہ وہ ادب جو انسان کی بنیادی ضرورت یعنی خوراک کے مسئلے کو حل کرے وہ بہترین ادب ہے۔ مارکسی تنقید ادب سے یہ توقع رکھتی ہے کہ وہ عوام کے لئے ہو۔ اشتراکی نظام میں مرکزی حیثیت محنت کش عوام کو حاصل ہے۔ مارکسی تنقید ادب میں اس عنصر کو تلاش کرتی ہے۔ جو اقتصادی مسئلے پر روشنی ڈالتا ہے۔ اور اس مسئلے کا حل پیش کر کے عوام کو عملی قدم اٹھانے کے لئے اکساتی ہے۔ مارکسی تنقید کا تعلق فرد سے عوام سے ہوتا ہے۔ یہ تنقید مادیت پر زور دیتی ہے اور روحانیت کو ٹھکراتی ہے۔ اس میں جمالیات کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مارکسی تنقید کسی ادب کو پرکھنے کے لئے خارجی اصولوں کو اہمیت دیتی ہے۔ مثلاً وہ سماجی اور سیاسی حالات جن کی روشنی میں کسی ادب پارے کو پرکھا جاتا ہے مارکسی نقاد زبان و بیان کے حسن کے بجائے خیال کو اہمیت دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ادب کو زندگی کا آئینہ ہونا چاہیے۔ ادب میں زندگی کا دل دھڑکنا چاہیے۔ مارکسی تنقید ادب برائے زندگی کا علمبردار ہے۔ مارکسی تنقید ادیب سے اس بات کا مطالعہ تو کرتی ہی ہے کہ عوام کے مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنائے زندگی کی علمبردار ہے۔ مارکسی تنقید ادیب سے اس بات کا مطالعہ تو کرتی ہی ہے کہ عوام کے مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنائے اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ ادب میں بول چال کی زبان یعنی سلیس و سادہ زبان استعمال کی جائے تاکہ ادب کی رسائی عام لوگوں تک ہو۔ مارکسی تنقید داخلیت اور ابہام کو اس لئے ناپسند کرتی ہے کیونکہ یہ چیزیں عوام سے ادیب کا رشتہ منقطع کر دیتی ہیں۔ اس کے نزدیک وہی ادب ادب ہے جو عوام کے جذبات کا ترجمان ہو اور ان ہی کی زبان میں گفتگو کرتا ہو۔ مارکسی تنقید و ادب کو محنت کش عوام کی زندگی کو بہتر بنانے کا ایک ذریعہ اور آلۂ کار خیال کرتی ہے۔

ابتداء میں مارکسی نقادوں نے اجتماعی زندگی کو ہی س کچھ سمجھ لیا تھا اور انفرادی زندگی کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ اس بات پر دوسرے نقادوں نے مارکسی ادیبوں پر بے حد تنقید کی۔ کیونکہ ادیب و فنکار کے لئے تو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے عہد اور ماحول سے کنارہ کرے اور نہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس کی شخصیت اور نجی زندگی کی پرچھائیاں اس کی تخلیقات پر نہ پڑے اس سلسلے میں اختر حسین رائے پوری کا کہنا ہے۔ ''ادب اپنے ماحول سے کچھ لیتا ہے۔ وہ اس قرض کو اپنی شخصیت کے سود کے ساتھ واپس کر دیتا ہے۔''

مارکسی تنقید ادیب و فنکار سے غیر جانبداری کی توقع کرتی ہے لیکن جس دنیا میں ظلم و زیادتی ہی ہو وہاں غیر جانبدار ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے فنکار اسے کھلی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ اس پر غور کرتا ہے اور آخر کار ظلم کے خلاف اور مظلوم کی حمایت میں اپنے فن کو استعمال کرتا ہے لیکن اس جانبداری کے نتیجے میں فن محض ''پروپیگنڈہ'' بن کر رہ جاتا ہے۔ فن نہیں رہتا۔ ادب اور فن کے ادب اور فن کے لئے سب سے پہلی شرف یہ ہے وہ ادب اور فن ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ جانبداری سے ادب و فن کی روح مجروح ہو جاتی ہے۔

۴) ترقی پسند تنقید:

ترقی پسند تنقید سے قبل اُردو ادب پر رومانی تنقید کا غلبہ تھا۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم ہوئی۔ اس کا پہلا جلسہ لکھنو میں ہوا۔ جس کے صدر منشی پریم چند تھے۔ اس جلسے میں ادب سے متعلق منشی پریم چند نے اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اُترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ، بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔ لکھنو کے جلسے میں ادیبوں نے یہ اعلان کیا کہ اب ادیب غیر جانبدار نہیں رہ سکتے۔ وہ مظلوموں کی حمایت کریں گے اور ادب کو زندگی سے وابستہ کریں گے۔ زندگی کے ارتقاء کا ادیب کو علمبردار بنائیں گے۔ اس تحریک کی ابتداء میں ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر بہت سے شاعر اور ادیب اس سے منسلک ہو گئے۔ اور ایسا ادب وجود میں آیا جو مندرجہ بالا اعلان نامے کے معیار پر پورا اترا تھا۔ جب اس قسم کا ادب وافر مقدار میں بڑھ گیا تو ترقی پسند کی بنیادی پڑی۔ اس طرح ترقی پسند نقادوں نے بہت جلد رومانیت کے طلسم کو توڑ دیا اور اُردو تنقید کو پھر سے اس راہ پر لایا جس کی بنیاد حالی نے رکھی تھی۔ مارکسی ادب، مارکسی تنقید اور ترقی پسند ادب و ترقی پسند تنقید دونوں کے اصولوں میں زرہ برابر بھی فرق نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مارکسی ادیب کسی بھی مذہب سے انکار کرتے ہیں یہ لوگ خدا کے وجود کے منکر ہیں۔

اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک اور اس کے علمبرداروں نے ایک نئی روح پھونک دی اور علم و ادب کو ایک نئے زاویے نگاہ سے دیکھنا شروع کیا انہوں نے ادب کو سماجی زندگی کی پیداوار سمجھا اور یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی کہ سماجی زندگی کے ساتھ ساتھ ادب کا بدلنا بھی بے حد ضروری ہے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے یہ بھی خیال ظہار کیا کہ ادب میں سماج کو بدلنے کی صلاحیت ہے اس طرح ترقی پسند تنقید نے ایک ایسی حقیقت پسندوں کی بنیاد ڈالی جو سماج کی انفرادی حقیقتوں کو گہری نظر سے جانتی ہے اور فنکار کی ذاتی ضرورتوں کو اس طرح آپس میں ملاتی ہے کہ فنکار کے ادبی کارناموں میں ادبی خلوص کی تڑپ کے ساتھ ساتھ تنقید حیات بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ نیا ادب کیا ہے؟ اس کا آغاز حالی کے اس خیال سے ہوتا ہے۔

''قاعدہ یہ ہے کہ جس طرح سے سوسائٹی اس کی باتیں اس کی عادتیں میلان ومزاج بدلتا ہے اسی قدر شعر کی حالت بدلتی ہے اور یہ ترتیب بے معنی نہیں ہے کیونکہ سوسائٹی کی حالت دیکھ کر شاعر اپنے آپ کو نہیں بدلتا بلکہ سوسائٹی ے ساتھ وہ خود بھی بدلتا جاتا ہے۔''

جن ادیبوں اور شاعروں نے ترقی پسند تنقید کو فروغ دیا ان میں اختر حسین رائے پوری، سجاد ظہیر، آل احمد سرور اور علی سردار جعفری کا بھی شمار ہوتا ہے۔ اختر حسین رائے پوری نے ایک مضمون ادب اور زندگی' کے عنوان پر لکھ کر اہل علم کو اپنی طرف متوجہ کیا اُردو کا یہ پہلا مضمون ہے جس میں ادب کا مارکسی نظریات کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی گئی۔

سجاد ظہیر کے تنقیدی نظریات میں اعتدال وتوازن پایا جاتا ہے۔ سجاد ظہیر جذباتیت سے دور رہتے ہیں۔ وہ ادب کو پروپگنڈہ بنانے کے خلاف ہیں۔ اس کا واضح ثبوت اُردو شاعری سے متعلق ان کا ایک مضمون اُردو کی جدید انقلابی شاعری گواہ ہے۔ مجنوں گورکھپوری ترقی پسند تنقید سے وابستہ ہونے سے قبل تاثراتی تنقید سے منسلک تھے۔ اپنی تحریروں میں انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ ادب سماج کا ایک اٹوٹ رشتہ ہے لیکن جب ترقی پسند نقادوں نے ادب کے فنی تقاضوں کو مسلسل نظر انداز کیا تو وہ اس تحریک سے بدظن ہوئے احتشام حُسین اس تحریک سے زندگی بھر وابستہ رہے۔

ممتاز حسین کا شمار بھی نامور ترقی پسند نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ اور وہ گہری تنقیدی بصیرت رکھتے ہیں۔ ان کا مقالہ ''ماضی کے ادب عالیہ'' سے متعلق ایک عرصے تک موضوع بحث رہا۔ اہل نظر نے اس کی شدید مخالفت کی لیکن بعد میں وہ ممتاز حسین کی رائے سے متفق ہو گئے۔ علی سردار جعفری شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ تنقید نگار بھی تھے۔ ترقی پسند تحریک سے ان کا تعلق مضبوط تھا۔ انہوں نے اس تحریک کی وکالت میں مبالغہ سے کام لیا تھا۔ اور اپنے جوشیلے مزاج کی بدولت اعتدال کی حد سے تجاوز کر گئے۔ ان کی تنقید توازن کے وصف سے خالی ہے۔

ترقی پسند نقاد ادب اور زندگی کے باہمی تعلق پر زور دیتے ہیں۔ یوں تو زندگی کے بہت سے شعبے ہیں لیکن ادب کا تعلق زندگی کے اس شعبے سے ہے جس کو تہذیب کے معاشی، اقتصادی اور طبقاتی حالات سازگار ہوتے ہیں۔ اس طرح ترقی پسند نقاد ادب کے ذریعے تہذیب وتمدن کو ترقی دینا چاہتے تھے وہ ادب کو طبقاتی کش مکش، دولت کی مساوی تقسیم اور اس سلسلے میں ایک انقلاب لانے کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اکثر تحریکوں کی طرح یہ تحریک بھی ادیبوں کی انتہا پسندی کا شکار ہوگئی۔ مقصدیت کی دھن میں ادیب فن کے تقاضوں کو بھول جاتے ہیں لیکن پختہ ذوق رکھنے والے ادبی نقاد اس سے اپنا دامن بچائے رکھتے ہیں۔ ترقی پسند تنقید کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس تنقید نے ذاتی پسند ناپسند کو تنقید کے دائرے سے خارج کیا۔ تنقید کے ٹھوس اصول مرتب کیے اور ادب کو

زندگی سے آنکھ ملانے اور زندگی کے مسائل کو حل کرنے کا حوصلہ عطا فرمایا۔

ہمارے ذہن میں بہت سی انجانی دنیائیں آباد ہوتی ہیں ہم جو کچھ کرتے ہیں یا کہتے ہیں اس میں ان دنیاؤں کا عکس نظر آتا ہے۔ جو علم ہمارے ذہن کے تہہ خانوں میں گھس کر سراغ رسانی یا جاسوسی کا کام کرتا ہے اسے علم نفسیات کہتے ہیں۔ یہ علم ان باتوں سے سروکار رکھتا ہے کہ انسان کس طرح سوچتا اور محسوس کرتا ہے اور کس موضوع پر اس کے جذبات کیا ہوتے ہیں علم نفسیات سے متعلق کثیر تعداد میں جب مواد اکٹھا ہوا تو اس وقت علم نفسیات کا آغاز ہوا نفسیاتی تنقید اسے کہا جاتا ہے جو ادیب یا فنکار کا شخص کا مطالعہ یا تجزیہ کرنے کے سلسلے میں علم نفسیات کا سہارا لیتی ہے۔

نفسیاتی تنقید کے ابتدائی نقوش سب سے پہلے ارسطو اور افلاطون کے یہاں نظر آتے ہیں ان دونوں کے علاوہ ہارک کے یہاں بھی نفسیاتی پہلو مل جاتے ہیں۔ فرانسیسی نقاد سینٹ بیو اور انگریز نقاد ہڈسن نے بھی اپنی تنقید میں علم نفسیات کا استعمال کیا ہے لیکن بہ حیثیت فن کے مغرب میں نفسیاتی تنقید کا آغاز سگمینٹ فرائڈ کے ذریعے ہوا۔ اس نے اپنے نظریے تحلیل نفسی یا نظریہ خواب کے ذریعے علم نفسیات میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ اس کے اثرات ادب اور تنقید دونوں پر بہت ہی گہرے پڑے اس کا نظریہ خواب'' نفسیاتی تنقید کا ایک دبستان بن گیا اس نظریے کے ذریعے اس نے ادب اور نفسیات میں ایک تعلق قائم کرنے کی کوشیش کی اور کہا کہ ادب کا اصل موضوع انسان ہے اور انسان کا ہر فعل عقل و شعور کے تابع نہیں کرتا۔ نفسیاتی پیچیدگی کو سلجھانے کے سلسلے میں فرائڈ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ ہمارا ذہن ایک تہہ خانے کی مانند ہے جس میں طرح طرح کا سامان اکٹھا ہے ہمارے ذہن کے دو حصے ہیں ایک شعور اور دوسرا لاشعور، شعور وہ حصہ ہے جسے انسان کا ظاہر بھی کہہ سکتے ہیں شعور کی دنیا میں انسان معاشرے اور مذہب کی پابندیوں کے ساتھ جیتا ہے اور لاشعور وہ حصہ ہے جہاں گہرا اندھیرا ہے یہاں وہ تمام چیزیں اکٹھا رہتی ہیں جنھیں ہر طرف ناپسند کیا جاتا ہے مثلاً جنسی خواہشات، لالچی اور خود غرضی اور ایسی خواہشات جو اتنی بُری ہوتی ہیں کہ جن کا ذکر کرنا بھی انسان پسند نہیں کرتا ہماری زندگی میں شعور سے زیادہ لاشعور کی کارفرمائی ہے لاشعور کی دنیا شعور سے زیادہ قوی ہے۔ ہماری وہ خواہشات جو حقیقی دنیا میں پوری نہیں ہو پاتی اور دنیا کے خوف سے لاشعور کی دنیا میں چھپی رہتی ہیں انہیں جب بھی موقع ملتا ہے وہ شعور کے طبقے میں داخل ہونے کی کوشیش کرتی ہے لیکن شعور ہر موقع پر پولس کانسٹیبل کا کام کرتا ہے اور نہیں پھر لاشعور کے طبقے میں ڈھکیل دیتا ہے جب ہم سوتے ہیں تو ہمارے ساتھ ہمارا شعور بھی سوتا ہے اس وقت ان دبی کچلی خواہشوں کو کھل کر کھیلنے کا موقع ملتا ہے اور یہ خواب کی شکل میں ہمارے ذہن کی سطح پر نظر آتی ہیں۔ شعور اور لاشعور کے علاوہ فرائڈ نے انسانی ذہن کو ایک اور طبقے میں تقسیم کیا ہے وہ ''تحت الشعور'' کہتا ہے۔ یہاں وہ چیزیں جمع ہوتی ہیں جنہیں ہم پوری طرح بھول بھی نہیں پاتے اور نہ صحیح طریقے سے یاد رکھتے ہیں یہ وہ چیزیں ہیں جو دماغ پر زور دینے سے شعور

کی سطح پر ابھر آتی ہیں۔

نفسیاتی تنقید کے متعلق اڈلر نے بھی بعض اہم نقطے بیان کئے ہیں اس کا کہنا ہے کہ احساس کمتری انسان کی زندگی میں اہم رول ادا کرتی ہے یہ احساس شروع سے آخر تک انسان کو گھیرے رہتا ہے مثلاً کمزور جسم کم ذہنی صلاحیت اور تجربے کی کمی کے سبب بچہ اپنے ماں باپ کا محتاج ہوتا ہے۔اس لئے یہیں سے اس میں کمتری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔آگے چل کر اسے یہ بھی تجربہ ہوتا ہے کہ وہ قدم قدم پر دوسروں کے سہارے کا اور سماج کی مدد کا محتاج ہے غرض انسان کو ساری زندگی احساس کمتری سے نجات نہیں مل سکتی اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کون اسے کس طرح برداشت کرتا ہے اس کا ردِعمل کیا ہوتا ہے؟ اس ردِعمل سے انسان کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے کوئی احساس کمتری پر قابو پانے کے لئے خود کو دوسروں سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے جسے احساس برتری کہا جاتا ہے انگریزی شاعر پوپ بہت لاغر تھا وہ خود کو دوسرے سے زیادہ صحت یا مند ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے جسے احساس برتری کہا جاتا ہے انگریزی شاعر پوپ بہت لاغر تھا وہ خود کو دوسروں سے زیادہ صحت مند ظاہر کرنے کے لئے اوپر تلے کئی جوڑ کپڑے اور کئی جرابیں پہن لیتا تھا۔غالبؔ کی داد و دہش ان کی تنگ دستی کا ردعمل تھی۔پریم چند کے افسانے کفن کے کردار گھیسو اور مادھو جب نشے کے عالم میں بچی ہوئی پوریاں خیرات میں دے دیتے ہیں تو گویا یہ سمجھتے ہیں کہ ساری زندگی کی فاقہ کشی کا بدلہ لے لیا۔مرزا عظیم بیگ چغتائی کی صحت بچپن ہی سے خراب رہتی تھی جس کی وجہ سے وہ جسمانی طور سے کمزور تھے وہ اپنے خاندان کے افراد میں پھوٹ ڈال کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے تھے اس لئے اپنے خاندان میں مرزا ''پھوہا'' کے نام سے مشہور تھے۔

کبھی کبھی احساس کمتری سے چھٹکارا پانے کے لئے انسان خیالی دنیا میں کھو جاتا ہے اور جس چیز کو وہ حقیقی دُنیا یا شعور کی دُنیا میں نہیں پا سکتا اسے وہ فرضی دنیا میں حاصل کرنے کی کوشش کرتا مثلاً میر تقی میر حقیقی دُنیا میں اپنی محبوبہ کو نہ پا سکے تو دیوانے ہونگے انہیں چاند میں ایک حسینہ نظر آنے لگی جو رات کی تنہائی میں چاند سے اتر کر ان کے پہلو میں آ بیٹھی اور ساری ساری رات ان سے باتیں کرتی۔پریم چند کے افسانے ''حج اکبر'' کا کردار نصیر بھی جب اس کی انا اسے حقیقی دُنیا میں نہیں ملتی تو تصورات کی دنیا میں وہ اس کے ساتھ رہنا شروع کر دیتا ہے احساس کمتری سے نجات پانے کی یہ دوسری شکل بہت ہی خطرناک ہے اس سے انسان طرح طرح کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور ذہنی بیماریوں میں مبتلا ہوتا ہے۔

ادب اصلاً انسان کا مطالعہ ہے اور انسان کو اس کے ذہن میں اترے بغیر سمجھنا ممکن نہیں اس لئے انسانی نفسیات سے واقف ہوئے بغیر ادب کا خالق ادب کی تخلیق نہیں کر سکتا۔انیس کو دبیر پر اس لئے فوقیت حاصل ہے کہ انہوں نے انسانی نفسیات کا غائر طور پر مطالعہ کیا تھا انیس نے اپنے مرثیوں میں انسانی جذبات کی ترجمانی بڑے ہی فنکارانہ انداز میں کی ہے جو انسان یا فنکار جتنا وسیع

المطالعہ جتنا حساس اور جتنے مختلف النوع تجربات کا حامل ہوگا اس کا ذہن اتنا ہی پر پیچ ہوگا ایک اچھے فنکار میں تینوں باتیں موجود ہوتی ہیں اس لئے اس کی ذہنی پیچیدگیوں کو سمجھنا بہت زیادہ دشوار ہوتا ہے لیکن تنقید نگار اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے مجبور ہے۔

اُردو میں خالص نفسیاتی تنقید کے اچھے نمونے کمیاب ہیں اُردو والوں نے تنقید کے سلسلے میں تحلیل نفسی کے نظریے کا استعمال کیا ہے وہ مختلف شاعروں کی نظموں کا تجزیہ نفسیاتی تنقید سے کرتے ہیں اس سلسلے میں مولوی وحیدالدین سلیم کا نام قابل ذکر ہے۔ان کے تنقیدی مضامین ''افادات سلیم'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں ان مضامین میں ہمارے شاعروں کی نفسیات اُردو شاعری کا مطالعہ اور سوداؔ کی ہجو یہ نظمیں قابل ذکر ہیں وحیدالدین سلیم کے بعد مرزا ہادی رسواؔ نے بھی شعروادب کو علم نفسیات کے وسیلے سے سمجھنے کی کوشش کی ان کے تنقیدی مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔

نفسیاتی تنقید کے اصول ومباحث پر ریاض احمد نے بھی قابل قدر کام انجام دیا ہے لیکن وہ فرائڈ سے زیادہ ''یونگ'' کے نظریے سے متاثر تھے۔تنقیدی مسائل اور تنقیدی جائزہ ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔اپنے ایک مضمون تحلیل وہ تنقیدی میں تحصیل نفسی کے حدود اور خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ادب کو نفسیات کے ذریعے حل نہیں کیا جا سکتا۔

سائنٹفک تنقید :

ادبی تخلیقات اور ان کی تخلیق کرنے والے فنکار کے متعلق تمام پہلوؤں پر بحث کرتی ہے اور ادبی تخلیق جس زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔اس زمانے کے سماجی حالات ومروجہ خیالات کی روشنی میں ان کی اہمیت کا پتہ دیتی ہے حقیقت پسندی، مقصدیت ادب وفن کا افادی نقطہ نظر اور فن صناعی کو نصب العین کے اظہار کا ذریعہ سمجھنا اور ان اصولوں کی روشنی میں ترتیب وتنظیم کو مدنظر رکھنا سائنٹفک تنقید ہے۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی سائنٹفک تنقید کا سب سے بڑا علمبردار ٹین (tain) تھا جس کے مطابق میں فنی اور ادبی تخلیق تین طاقتوں کی پیداوار ہوتی ہے۔

(۱) فن کار کے خاندانی حالات اور اس کی قومی ونسلی خصوصیات۔

(۲) وہ ماحول جس میں فنکار نے پرورش پائی تعلیم وتربیت حاصل کی۔

(۳) اس عہد کے سماجی معاشی اور مذہبی حالات جس کے زیر اثر اس تصنیف کی تخلیق ہوئی۔

''برائٹ فلیڈ'' نے بھی سائنٹفک تنقید کی خصوصیات اس طرح بیان کی ہے۔

(۱) سائنٹفک تنقید کو تجزاتی ہونا چاہیئے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس مواد پر اپنی بنیاد رکھے جس کو جانچا اور پرکھا جا سکے۔

(۲) اس کے پاس کوئی مقصد بھی ہونا ضروری ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے پاس مواد کا ہونا بھی ضروری ہے جس کے اثرات اس کے نظریے اور مقصد پر پڑے۔

(۳) نقاد کو چاہیے کہ مواد کے دائرے میں رہ کر ایک منطقی طریقے کی بنیاد ڈالے۔

سائنٹفک نقادوں میں ''ہرڈر بھی بے حد شہرت رکھتا ہے۔ اس کے خیالات نے نہ صرف تنقید نگاروں کو بلکہ اس زمانے کے فلسفیوں اور مفکروں تک کو متاثر کیا ہے اس قسم کے خیالات ۲۰ ویں صدی کے شروع میں بہت عام ہوئے اور ان خیالات کے پیش کرنے میں ہرڈر کے ساتھ ساتھ میڈم دی اسٹیل بھی برابر شریک ہیں۔ یہ سب نقاد ادب کو سماجی پس منظر میں پیش کرنے کے قائل نہ تھے بلکہ وہ اس میں ادبی وفنی زندگی کے اقدار کا پتہ لگانا بھی ضروری سمجھتے تھے۔ سائنٹفک تنقید سے مراد معروضی تنقید ہے یعنی ادب کو ایسے معیاروں پر پرکھنے کی کوشش کرنا جن میں سائنس کی سی صحبت قطعیت اور غیر جانب داری ہو اس تنقید میں یہ گنجائش نہیں کہ نقاد اپنی ذاتی پسند نما پسند اور نجی تعلیمات پر کوئی فیصلہ صادر کرے یہ تنقید ایک ردعمل ہے ان تمام تنقیدوں کے خلاف جن کے پاس کوئی اصول کوئی ضابطہ نہیں ہوتا۔ سائنٹفک تنقید کے سلسلے میں ایک دشواری یہ رہی ہے کہ مختلف دبستان مثلاً: تاریخی، جمالیاتی، اشتراکی (کارکسی) سب نے اپنے اپنے اصول بنائے اور ان پر ادب کو پرکھا۔ اس لئے یہ سب اس بات کے دعویدار ہیں۔ کہ ان کی تنقید سائنٹفک ہے مگر ان کا دعویٰ غلط ہے مثلاً جمالیاتی تنقید اس بات کا سراغ لگاتی ہے کہ فن پارہ ہمیں پسند ہے تو اس کا کیا سبب کیا ہے اور ان میں کون سا حسن ہے جو ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے لیکن جمالیاتی تنقید یہ بتانا بھول جاتی ہے کہ وہ کون سے مادی اسباب تھے جنہوں نے اس فن پارے کو جنم دیا۔ اسی طرح نفسیاتی تنقید فنکار کے ذہن تک تو پہنچتی ہے لیکن باقی تمام چیزوں سے بے خبر رہتی ہے حقیقت یہ ہے کہ صرف وہی تنقید سائنٹفک تنقید کہلانے کی مستحق ہے۔ جو فن اور فنکاروں کو ہر زاویے سے دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کرے۔

شارب رُدولوی لکھتے ہیں کہ سائنٹفک تنقید ادبی تخلیقات اور فنکار سے متعلق تمام مباحث کو اپنے اندر سمو لیتی ہے اور جمالیاتی، نفسیاتی، سماجی اور مروجہ خیالات کی روشنی میں فنی تخلیق کی اہمیت کا پتہ دیتی ہے تنقید یہ نظریہ ادب اور ادیب کو سمجھنے میں مددگار ہوتا ہے۔ Scientific تنقید اور روایت پسندی کو پسندگی کی نظر سے نہیں دیکھتی وہ ادب کے فروغ کے لئے نئے نئے تجربوں کو ضروری سمجھتی ہے یہ تنقید ادب برائے ادب کے نظر کو شک کی نظر سے دیکھتی ہے کیونکہ وہ فن کو سماج سے جُدا کر دیتا ہے سائنٹفک تنقید تصوف پرستوں کو پسند نہیں کرتی۔ کیونکہ یہ لوگ حقیقت کی دُنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتے یہ تنقید ماضی کی روایت کا احترام تو کرتی ہے۔ لیکن ماضی پرستی کی ترغیب نہیں دیتی۔ سائنٹفک تنقید کے کچھ اپنے اصول ہیں یہ اصول کسی فرد یا کسی گروہ کی ذاتی پسند سے نہیں بنائے گئے ہیں بلکہ خود تخلیق سے لیے گئے ہیں۔ جو نقاد ان اصولوں کو وضع (بنانا) کرتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ معروضی مطالعہ کرنے

کی صلاحیت رکھتا ہو اور اس کے مزاج میں جلد بازی نہ ہو۔

سائنٹفک تنقید کی زبان سادہ اور علمی ہو۔ سراہیت اور قطعیت اس کے لئے بے حد ضروری ہے دیگر دبستان تنقید کی طرح سائنٹفک تنقید بھی مغرب ہی میں فروغ پائی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اُردو تنقید میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ سائنٹفک تنقید سے متعلق سب سے پہلے سرسید نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کیونکہ وہ ہر چیز کو عقل اور سائنس کی کسوٹی پر کسنے کی عادی تھے زندگی بھر وہ مختلف سرگرمیوں میں مصروف رہے اس لئے وہ تنقید کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہ دے سکے۔ لیکن رہبری کا فرض انہوں نے بے شک ادا کیا۔ ان کے تنقیدی نظریات ان کے مختلف ان کے تنقدی نظریات ان کے مختلف مضامین میں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں جس نقاد کے یہاں سائنٹفک تنقید مکمل طور پر نظر آتی ہے وہ حالی یں حالؔی نے اُردو تنقید کو ایک جامع نظام عطا کیا ادب اور زندگی کے مضبوط تعلق کی وضاحت کی مقصدیت کو ادب کی روح قرار دیا۔ شعر کی ماہیت پر نظر ڈالی۔ اچھی شاعر کی خصوصیات متعین کیں غرض حالؔی نے اُردو تنقید پر ایک احسان عظیم کیا۔

سائنٹفک تنقید کو سمجھنے کے لیے اسلوب احمد انصاری کے مضمون کا مطالعہ ضروری ہے انہوں نے لکھا ہے کہ ''سائنٹفک تنقید'' اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے کہ تاریخی و مادی حالات ہی کسی خاص طرح کے ادب کو جنم دیتے ہیں ''مواد اور ہیئت اس طرح گھلے ملے ہوتے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا تاہم مواد کی اہمیت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔''

اُردو میں سائنٹفک تنقید نگاروں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، سید وقار عظیم، عزیز احمد اختر اورینوی، شمس الرحمٰن فاروقی، وزیر آغا اور نظام صدیقی وغیرہ اس لیے اہم ہے کہ انہوں نے نصب العین کو اپنا مطمع نظر نہیں بنایا۔ وہ جذبات کے دھندلکوں اور اور پُر شوکت جذبات کا سہارا نہیں لیتے۔ بلکہ فنی کارناموں کی تشریح فنکار کی شخصیت اور اس کے مادی حالات کے تجزیے کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔

دو شاعروں یا ادیبوں یا ان کے ادبی کارناموں کا مقابلہ و موازنہ تقابلی تنقید ہے۔ اُردو ادب میں ابتداء ہی سے یہ تنقید موجود ہے۔ تقریظوں اور تذکروں کے مصنفین تقابلی تنقید سے کام لیتے تھے اور اُردو شاعری کا عربی فارسی کے کسی شاعر سے تقابل کر کے اس خاص شاعر کی خصوصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھہ کہ تذکرہ نگاروں کے سامنے عربی ار خصوصاً فارسی شعراء اور ان کا سرمایہ کلام مثالی نمونے کی حیثیت سے موجود تھا اور وہ اسی کسوٹی پر اُردو شعراء کو پرکھنا چاہتے تھے۔

موازنہ اور تقابلی مطالعہ ایک فطری امر ہے۔ انسان دو چیزوں کے درمیان مقابلہ کر کے خوب سے خوب تر کی جستجو کے جذبے کی تسکین کرتا ہے۔ اس لئے ہر زبان میں تقابلی تنقید کا طریقہ رائج رہا ہے۔ موازنہ تنقید کا ایک موثر طریقہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے

میں ہمارے سامنے عربی میں کسی شاعر کو سب سے بہتر سخن گو شاعر تسلیم کرتا وہ والشعر الناس، یا عوام کا عظیم ترین شاعر تصور کیا جاتا تھا مختصر یہ کہ عربوں کو تقابلی تنقید سے بہت دلچسپی رہی ہے۔ تقابلی تنقید میں عرب نقادوں نے دو طریقے اختیار کیے ہیں۔

(۱) دو شاعروں کا موازنہ و مقابلہ کر کے فیصلہ قاری پر چھوڑنا۔

(۲) دو شاعروں یا ادیبوں کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد فیصلہ صادر کرنا۔

عربی نقاد 'ابوالبشر حسن بن آمدی' پہلے طریقے پر کاربند رہا اور قاضی جرجانی دوسرا طریقہ اختیار کر لیا۔ موازنہ انیس و دبیر میں شبلی نے ابوالبشر حسن بن آمدی' کی تقلید کی ہے۔ بعض عربی ناقدین نے یہ نظریہ قائم کیا کہ موازنہ دو ایسے شاعروں اور ادیبوں کے درمیان کیا جانا چاہیے جن میں بہت سی شاعرانہ خصوصیات مشترک ہوں دو بالکل جداگانہ مزاج اور معیار کے شاعروں کا آپس میں مقابلہ کرنا درست نہیں ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو شاعروں میں انیس و دبیر ایسے مرتبہ کے ہیں۔ جن کے موضوع اور منتخب کردہ صنف سخن میں اشتراک ہے۔ ان دونوں شاعروں میں خاصی یکسانیت موجود ہے اسلئے ہم موازنہ کے ذریعے سے ان کی انفرادی خصوصیات کا اندازہ لگا سکتے ہیں یا غالب اور مومنؔ دونوں غزل کے بلند پایہ شاعر ہیں۔ ان کا تعلق بھی ایک عہدے سے ہے۔ اور دونوں مشکل پسند شاعر ہیں اس لئے ان دونوں کا موازنہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ہر شئے اپنی ضد سے پہنچانی جاتی ہے۔ اس لئے بعض نقاد ایسے دو ادیبوں اور شاعروں کا موازنہ بھی درست تصور کرتے ہیں۔ جن میں متضاد خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مثلاً: میرؔ اور سوداؔ کا مقابلہ، میرؔ کا کلام سوز و گداز، دردمندی اور غم ناکی کا مرقع (تصویر) ہے۔ اور سوداؔ کا کلام اس کے برعکس شگفتگی، زندہ دلی، اور طنز و مزاح کی تصویر ہے۔ اس لئے نقاد کہتے ہیں کہ میرؔ کا کلام آہ اور سودا کا کلام واہ ہے ان دونوں کے کلام کا موازنہ کر کے ہم ان کے شاعرانہ مرتبے اور ان کے منفرد طرز ادا وغیرہ کا بہ خوبی اندازہ کر سکتے ہیں مقدمہ شعر شاعری میں حالیؔ نے مشرق و مغرب کے اہل نظر اور شعراء کے خیالات و تصورات اور ان کے اقوال پہلو بہ پہلو پیش کر کے ان کا مقابلہ و موازنہ کیا ہے اسی طرح عبدالرحمٰن بجنوری نے 'محاسن کلام غالبؔ' میں غالبؔ کے کلام کا موازنہ کیا ہے اسی طرح عبدالرحمٰن بجنوری نے 'محاسن کلام غالبؔ کے کلام کو ان کے عہد کے سماج و تہذیبی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی۔ اور غالبؔ کے خیالات و تصورات کا مغرب کے فلسفیوں اور دانشوروں سے مقابلہ کیا ہے۔

موجودہ زمانہ کے نقاد اپنی زبان کے علاوہ دوسری مغربی زبانوں کے ادب سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مغربی زبانوں کے ادب سے واقفیت نے جب ان کی ادبی معلومات میں اضافہ کر دیا تو وہ اپنے شاعروں اور مصنفین کے فن کا تجزیہ کرتے ہوئے شاعروں اور مفکرین سے ان کا مقابلہ کرے۔ فطری طور پر دو یکسانیت رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کا موازنہ کر کے اپنے

مطالعے سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں مثال کے طور پر یورپ کے قیام کے دوران علامہ اقبال وہاں کے بعض مفکرین کے خیالات و افکار سے بے حد متاثر ہوتے تھے۔اس سے ان نقاد نے یہ سوچا اگر ہم مغربی فلسفیوں کے خیالات سے ان کے تصورات کا مقابلہ کریں گے تو بے محل نہ ہوگا مختصر یہ کہ جدید ادب میں تقابلی مطالعہ اپنا مقام بنا چکا ہے۔

تقابلی نقاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ زیر بحث شعراء کے مخصوص خیالات پر بھی نظر رکھے مثال کے طور پر انشاء مصحفی کا موازنہ کرتے ہوئے ان شعراء نے ایک دوسرے کے خلاف جو اشعار کہے ہیں انہیں پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے نقاد کا مقصد کسی ادبی مفکر کی تفصیل بیان کرنا نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں شخصیت و فن کا مطالعہ کرنا اور صحیح نتائج تک رسائی حاصل کرنا ہے اسی طرح غالبؔ و ذوق، میر حسین و نسیم، (پنڈت دیا شنکر نسیم) آتش و ناسخ، داغ و امیر اور حالیؔ اور شبلیؔ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔تقابلی نقاد کے لئے ضروری ہے کہ اپنے موضوع پر اس کی گرفت مضبوط ہو ہو کر مومن کی تغزل مقابلہ کیا جائے تو اس کی غزل گوئی کی تمام خصوصیات پر نظر رکھنا ضروری ہے صرف دو یا تین امور کی روشنی میں موازنہ درست نہ ہوگا اس سے مومن کے تغزل کی حقیقی قدر و قیمت سامنے نہ آ سکے گی۔ تقابلی نقاد کے لئے حسب ذیل امور کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔

۱) غیر جانبداری

۲) انصاف پسندی

۳) مقابلے و موازنے کی صلاحیت

۴) زیر بحث شعراء کے فن سے اچھی طرح واقفیت

۵) یک طرفہ فیصلہ سے گریز

۶) جذباتیت سے پرہیز

جب ہم اُردو ادب میں تقابلی تنقید کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ خود شعراء کے کلام میں بھی تقابلی تنقید کی جھلک نظر آتی ہے۔لیکن یہ مقابلہ با قاعدہ تنقید کی تاریخ میں نہیں آ سکتا۔مختصر یہ کہ تقابلی تنقید میں اگر فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ ایک موثر طرزِ تنقید ثابت ہو سکتی اور اس سے ادب استفادہ کر سکتا ہے۔

۳۷۔۱ خود جانچنے کے سوالات :

۱) دبستان تنقید کا آغاز کس طرح سے ہوا ؟

۲) تاثراتی تنقید پر نوٹ لکھئے؟

SHIVAJI UNIVERSITY, KOLHAPUR

شیواجی یونیورسٹی ، کولھا پور

Humanities

B.A. PART - III

بی۔ اے ۔ سال سوم

SEMESTER - VI

Syllabus : URDU

Paper No. XIV

Paper Name : URDU TAHEQIQ

اردو تحقیق

Dr. Bilquis Begum

Head Of Department, Urdu

Surendranath College, Kolkata (West Bengal)

مصنفہ :۔ ڈاکٹر بلقیس بیگم

(صدرشعبہء اردو)

سریندرناتھ کالج، کولکاتا (مغربی بنگال)

SHIVAJI UNIVERSITY, KOLHAPUR

شیواجی یونیورسٹی ، کولھا پور

B.A. PART - III

بی۔ اے ۔ سال سو م

SEMESTER - VI

Syllabus : URDU

Paper No. XIV

URDU TAHEQIQ

اردو تحقیق

Dr. Bilquis Begum

Head Of Department, Urdu

Surendranath ColLege, Kolkata (West Bengal)

مصنفہ :۔ ڈاکٹر بلقیس بیگم

(صدر شعبہء اردو)

سریندر ناتھ کالج ، کولکاتا (مغربی بنگال)

بی ۔ اے۔ سال سوم (سمیسٹر ششم)

URDU TAHEQIQ

اردو تحقیق

برائے نصاب

صفحہ نمبر	Name of Chapter	ابواب
04	**Fane Taheqiq**	باب 1 فن تحقیق
22	**Taheqiq Aur Tariqe Kar**	باب 2 : تحقیق اور طریقہ کار
40	**Mauwad Ki Farhami**	باب 3 : مواد کی فراہمی
54	**Hawala Aur Hawale Dene Ke Tariqe Kar**	باب 4 : حوالہ اور حوالے دینے کے طریقہ کار

باب : اول

فنِ تحقیق

1.0 **اجزاء**

1.1 مقاصد

1.2 تمہید

1.3 موضوع کی وضاحت

1.3.1 تحقیق کی تعریف

1.3.2 تحقیق کی خصوصات

1.3.3 تحقیق کی ضرورت اوراہمیت

1.3.4 تحقیق کے مقاصد

1.3.5 تحقیق کے لوازمات

1.3.6 تحقیق کے ذرائع

1.3.7 تحقیق کی اقسام

1.4 خلاصہ

1.5 نمونے کے امتحانی سوالات

1.6 فرہنگ

1.7 سفارش کردہ کتابیں

1.1 : مقاصد

اس باب کے مطالعہ کے بعد طلباء سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ۔۔۔

☆ تحقیق کے معنی ومفہوم واضح کرسکیں گے۔

☆ تحقیق سے کیا مراد ہے؟ یہ بتاسکیں گے۔

☆ تحقیق کی تعریف بیان کرسکیں گے۔
☆ مشرقی اور مغربی مفکرین نے پیش کیے ہوئے تحقیق سے متعلق تعریف بیان کرسکیں گے۔
☆ تحقیق کی خصوصیات بیان کرسکیں گے۔

1.2 : تمہید

تحقیق ایک قدیم فن ہے۔اس فن کی اہمیت وافادیت تمام علوم وفنون میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔تحقیق کی ابتدا کب اور کہاں ہوئی اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔لیکن اس کے آغاز کے متعلق ایک مشترک نظریہ ہے کہ انسانی تہذیب وتمدن کی ابتدا کے ساتھ اس کا (تحقیق) آغاز ہوا ہے۔تحقیق کا ارتقائی سفر صدیوں پر محیط ہے۔ لیکن تحقیق کا تصور سب سے پہلے اہل یونان کے مفکر ارسطو کے یہاں نظر آتا ہے۔ارسطو کے تحقیقی نظریے کی بنیادی دلیل یہ ہے کہ کسی بات کو اس وقت تک تسلیم نہ کیا جائے جب تک اس کا ثبوت مع صداقت اور دلیل پیش نہ ہو۔ارسطو کے اس نظریے نے فنِ تحقیق کو ایک نیا رنگ اور روش عطا کی۔گویا تحقیق کی دنیا میں ایک نیا انقلاب برپا ہوگیا۔اس طرح مفکر تحقیق کے میدان میں اپنے قلم کی جولانی دکھائی۔ ہر شئے کی حقیقت یا مسئلہ کی نوعیت اور اس کے حل کے لئے مختلف دلائل اور مفروضوں کو پیش کیا جانے لگا۔اور یوں مشاہدات وتجربات اور آراء کا ایک گہرا سمندر چاروں طرف نظر آنے لگا۔ ہر شئے کی جانچ پڑتال کی ایک روایت سی بن گئی تھی۔لہٰذا فنِ تحقیق کے میدان میں وسعت پیدا ہونے لگی۔تاہم اس فن کو اہل عرب نے خوب پروان چڑھایا۔الفارابی، الغزالی۔ابن خلدون، ابن سینا اور ابن رشد جیسے سائنس دانوں اور ماہرین علوم نے جدید ریسرچ کے طریقہء کار کی نہ صرف بنیاد ڈالی بلکہ اس فن کے ہر پہلو کو واضح طور پر اجاگر بھی کیا۔ آج جس سے یورپین ممالک استفادہ کررہے ہیں۔

وقت اور حالات کی تغیر پذیری نے فنِ تحقیق کے طریقہء کار پر اپنے مثبت اثرات قائم کئے۔سترھویں صدی کی ابتداء میں جدید سائنس کی تحریک نے تحقیق کے طرز فکر اور طریقہء کار پر مزید روشنی ڈالی۔ نیوٹن جیسے سائنس دانوں نے فنِ تحقیق کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے نت نئے تجربات کئے جنہوں نے آگے چل کر تحقیق کے طریقۂ کار کو مزید تقویت بخشی۔سائنس دانوں نے جدید تصور تحقیق کے طریقۂ کار کی بنیاد اس طرح پیش کی۔

۱) سب سے پہلے کسی شئے کی اصلیت یا موضوع کا احساس اور اس کا طرز فکر کیا ہونا چاہیئے؟

۲) حقیقت اور صداقت کی تلاش میں جستجو و تجسس کی سنجیدگی کا ہونا بے حد لازم ہے۔

۳) مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں معلومات حاصل کرنا۔

۴) حاصل شدہ معلومات کا تجزیاتی مطالعہ۔

۵) نتائج فکر سے نظریات کا قائم کرنا۔

۶) نئے نظریات کی دوبارہ تصدیق اور مشاہدہ کیا جائے۔

۷) دوبارہ تجربات و مشاہدات کی روشنی میں تنقیدی جائزہ پہلے نظریے کے مطابق لیا جائے۔

۸)ا یک نیا اصولِ تحقیق نافذ کیا جائے۔

مذکورہ نکات نے سائنس کے شعبہء حیات میں ایک ہنگامہ خیز تاریخ رقم کی۔اسطرح سائنسی علوم کا دائرہ عمل وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔اور نئے نئے دریافت وانکشافات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔عصر حاضر میں برقی رفتار کی ترقی نے زمین سے آسمان تک کا سفر چند گھنٹوں میں طے کرلیا ہے۔یہ سب فن تحقیق کی مرہون منت ہے۔

1.3 : موضوع کی وضاحت

1.3.1 : تحقیق کی تعریف

تحقیق بادی النظر میں ایک لفظ ہے لیکن اپنے اندر بے پناہ روشنی اور قوت رکھتا ہے۔تحقیق کی تعریف اور مفہوم کو مختلف اہل دانشوروں اور ماہرین علم نے اپنے اپنے طور پر واضح کیا ہے۔علم تحقیق کی تعریف مغربی و مشرقی دانشوروں کی جو یوں ہے۔

لفظ ''تحقیق'' عربی زبان کا مصدر ہے۔جس کا مادہ حقق۔

محقق۔تحقیقا سے ماخوذ ہے۔جو باطل کی ضد ہے۔حق کا مطلب سچائی ثابت کرنا، یا ثبوت فراہم کرنا ہے۔تحقیق کی تعریف مختلف لغت میں یوں پیش کی گئی ہے:

ا) عربی کی مشہور لغت ''لسان العرب'' کے مولف منظور الافریقی لکھتے ہیں:

''حق باطل کی ضد ہے اور اس کی جمع حقوق آتی ہے، ابو اسحاق فرماتے ہیں کہ حق سے مراد بنی آدم کی بات ہے جو کہ حق ہے اور اس کے معنی ثابت ہونا ہے اور حق بات یقینی امر میں ہوتی ہے۔''

۲) ''درسی اور لغت'' میں تحقیق کی تعریف یوں ہے:

''حق بات دریافت کرنا۔ اصلیت کی کھوج لگانا۔ ہم معانی تجسس، تلاش جانچ، پڑتال۔''

۳) کیمبرج ڈکشنری ''آن لائن'' کے مطابق

"A detailed study of a subject especially in order to discover (new) information or react as (new) understanding"

۴) آکسفوڈ انگلش ڈکشنری میں تحقیق کے معنی:

" To search into matter of a subject to investigate of study closely"

(کسی موضوع کے مواد کی تحقیق کرنا۔ تلاش کرنا یا باریک بینی سے مطالعہ کرنا۔)

To search again and respeatedly

(دوبارہ جستجو کرنا اور بار بار تلاش کرنا)

۵) Oxford Reference Dicdionery

میں تحقیق سے مراد

"To establish facts and reach new conclusion"

(حقائق متعین کرنا اور نئے نتائج پہنچنا)

مذکورہ بالا آراء کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ تحقیق ایسے طرز مطالعہ کا نام ہے جو کسی معاملہ کی تصدیق و تردید کو حق اور صداقت کی کسوٹی پر پرکھتی ہے۔ یعنی تحقیق سے مراد کھرے کھوٹے کی چھان بین کرنا ہے اور حق کو باطل سے الگ کرنا ہے۔ لفظ تحقیق کو انگریزی زبان میں Research کہا جاتا ہے۔

Research کے مفہوم کو پروفیسر B.R. Pandu نے یوں واضح کیا ہے:

R = Retional way of thinking

(مبنی بر عقل سوچ یا سوچنے کا عقلی طریقہ)

E= Expert and comprehasive treatment.

(ماہرانہ اور مکمل برتاؤ)

S = Search for solution

(حل کی تلاش)

E= Exactness
(درستی وصحت)
A = Analysis
(تجزیہ)
R= Relationship of facts
(حقائق کا تعلق)
C = Critical observation
(تنقیدی مشاہدہ)
H= Honesty and Hardship
(دیانت اور مشکلات)

ان تمام خیالات کو ایک جملے میں یوں سمیٹا جاسکتا ہے کہ تحقیق سے حقیقت کی تلاش اور حقائق کی بازیافت کرنا ہے۔

1.3.2 : تحقیق کی خصوصیات

یعنی تحقیق جدید علم نہیں ہے۔اس کی ابتدا انسانی تہذیب کے ساتھ ہی ہوئی ہے۔اس علم کی ابتدا کی تعریف اور اس کے ارتقائی سفر کا رشتہ انسانی زندگی سے کچھ اس طرح وابستہ ہے کہ ایک دوسرے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ہماری تہذیب وتمدن کے ارتقائی سفر کو سمجھنے کے لئے تحقیق ایک رہبر کی حیثیت رکھتی ہے۔تحقیق کا خمیر کرید، جستجو اور تجسس کے جذبات واحساسات سے تیار ہوتا ہے۔اس کی سب سے خوبصورت مثال یہ ہے کہ آج بھی کائنات کی تسخیر اور فطرت کے پوشیدہ راز کو تحقیق کے علم کے ذریعہ سمجھنے کی سعی کی جارہی ہے۔دراصل علمِ تحقیق ایک جبلی طاقت ہے، جو انسانی تہذیب کے ارتقائی سفر سے لیکر موجودہ دور کے مسائل کو حل کرنے اور اپنی دست رس میں رکھنے کا ہنر کا نام ہے۔ علم تحقیق ایک قیمتی دولت ہے جس کے خرچ سے اضافہ ہی ہوتا ہے۔تحقیق کے ذریعہ سینکڑوں برسوں کے فلسفیانہ نظریات ونظام کے منفی ومثبت اثرات کو واضح طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔تحقیق ایک نئی منزل کا پتہ دیتی ہے۔ ہر شعبہء علم میں تحقیق کو مرکزیت حاصل ہے۔خصوصاً سائنس اور سماجی سائنس کی دشوار کن راہوں کو بغیر تحقیق کے طے نہیں کیا جاسکتا ہے۔گویا ہر قدم پر تحقیق کی از حد ضرورت پڑتی ہے۔کائنات کو تسخیر کرنے کا نازک نکتہ ہو یا لاشعوری گرہ کو کھولنے کے لئے تحقیق ہی واحد زینہ ہے۔تحقیق کے متعلق پروفیسر Bonany Dobree کا خوبصورت قول ہے: "Research is

the purest blessing that we know"

تحقیق ایک تحریک ہے جو نئی حقیقت کی تلاش کی راہ دکھاتی ہے، اور اس کا ہر عمل متحرک ہوتا ہے۔ ہر انکشاف دلچسپ و حیرت انگیز سے پر ہوتا ہے۔ ریسرچ کے وسیلے سے انسان بہتر معاشرے کی تشکیل کرتا ہے اور تہذیبی اقدار کو باوقار بناتا ہے۔ اور ایک خوبصورت سماج کا ڈھانچہ تیار کرتا ہے۔

1.3.3 : تحقیق کی ضرورت اور اہمیت

ایک خوبصورت معاشرے کی ترقی اور خوشحالی کے لیے تحقیق عملی میدان ہے۔ جس کے ذریعہ یہ زندہ معاشرے کی بنیادی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اس امر کی وضاحت کا اہم مقصد ہے کہ نئے علوم کے وسیلے سے بہتر سماج کی تشکیل ہوتی ہے۔ بہتر معاشرہ ہی ترقی یافتہ قوم کی گواہ بنتا ہے۔ اور خوشحال قوم کامیاب انسانی تہذیب کی تاریخ رقم کرتی ہے۔ گویا روشن مستقبل کی ترقی کی اساس تحقیق کی مرہون منت ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ یہ ایک صبر آزما عمل ہے اس مرحلہ میں جو نتائج سامنے آتے ہیں، اسے ذاتی جذبات و احساسات اور زور بیان اور جانب داری دلائل کے بل بوتے سے گریز کیا جائے۔ بلکہ شہادت اور ماخذات کی روشنی میں فکر نتائج کو سائینٹفک اصولوں کے مطابق چھان پھٹک کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے کہ تحقیق کے بغیر انسان کی فلاح و بہبود اور ترقی کا سفر ادھورا ہے تو غلط نہ ہوگا اس سلسلے میں ایک خوبصورت مثال ملاحظہ فرمائیے:

تحقیق کے حوالے سے قرآن پاک میں سورۂ الحجرات۔ پارہ ۲۶ر آیت نمبر ۲ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق (بدکردار، غیر ذمہ دار شخص) کوئی خبر لے آئے تو اس کی خوب تحقیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو بے علمی میں ضرر پہنچاؤ پھر تم اپنے کیے پر پچھتانے لگو۔''

اس آیت کریمہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی غیر ذمہ دار آدمی کسی معلومات یا بات آ کر بتائے تو فوراً اس کی بات کو قبول نہیں کرنا چاہیے۔ حالانکہ صبر و تحمل سے پوری بات سنی جائیے۔ اور معاملات کی تہہ تک پہونچا جائے تا کہ صداقت آئینہ کی طرح صاف و شفاف نظر آئے۔ تحقیق کا بنیادی مقصد حقائق کی چھان بین کرنا ہے۔ وہ حقائق جو ہماری نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں، جسے فنِ تحقیق کے ذریعہ ہی عیاں کیا جا سکتا ہے۔ گویا تحقیق کے ذریعے حقیقت کی تلاش کو ضروری قرار دیا گیا تا کہ بعد کے نقصانات اور پچھتاوے سے محفوظ رہے۔ تحقیق کا رجحان انسانی زندگی کی ترقی و خوشحالی کا زینہ

ہے۔

موجودہ دور میں تحقیق ایک چیلنج کے روپ میں سامنے آئی ہے۔انسانی طرز زندگی کو آرام دہ اور پر مسرت بنانے میں بہت ساری مادی اشیا کی ترقی پر منحصر ہے۔آج تحقیق کی بدولت ریل اور ہوائی جہاز کی تیز رفتاری نے سفر اور رسل و رسائل میں آسانیاں پیدا کی ہیں۔انجیرنگ کے حیرت کن کارناموں نے عقل کو مبہوت کر دیا ہے۔بجلی کی روشنی نے رات کے اندھیروں کو اجالوں میں تبدیل کر دیا ہے۔انٹرنیٹ کے ذریعہ ایک ملک کو دوسرے ملک سے بے حد قریب کر دیا ہے۔فاصلوں کو سمیٹ دیا ہے۔تحقیق کی بدولت بنجر زمین لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں بدل رہی ہے۔میڈیکل سائنس کے نت نئے تجربات ومشاہدات نے بہت سارے خطرناک امراض کا خاتمہ کیا، اوران کا علاج کرنے میں کامیاب بھی رہے۔علوم وفنون کی ترقی نے انسانی تہذیب میں شائستگی عطا کی۔

تحقیق کی اہمیت زبان و ادب میں بھی منفرد حیثیت رکھتی ہے۔زبان یا بولی انسان کی سماجی زندگی کی اہم ضرورت ہے۔اس کے بغیر انسان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔زبان ہی اظہار کا وسیلہ ہے۔سماجی رشتے کی مضبوطی اور مستحکم زبان پر قائم ہوتی ہے۔تمام علوم وفنون کی ترقی زبان پر منحصر ہے۔زبان کو زندہ رکھنے کے لئے ''تحقیق'' وتنقید کی ضرورت لازم ہے۔تحقیق کے وسیلے سے ہم زبان وادب کی پیچیدگیوں کو سائینٹفک انداز سے سلجھانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔مختصراً تحقیق کی اہمیت زندگی کے تمام شعبہء حیات میں اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔تحقیق کے بغیر دنیا کے تمام علوم وفنون کی گہرائیوں کو نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔گویا تحقیق ہماری زندگی میں ایک مشعلِ راہ کا کام انجام دیتی ہے۔

1.3.4 : تحقیق کے مقاصد

تحقیق کا مقصد پورے انسانی معاشرے کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے ایک مسلسل کوشش کا نام ہے۔اس کے فوائد کا دائرہ کار مخصوص سماج، ملک، قوم کے لئے نہیں ہوتا ہے۔بلکہ تحقیق کے ذریعہ پوری دنیا کی ترقی اور خوشحالی کی راہیں استوار ہوتی ہیں۔نت نئے ایجادات اور انکشافات انسانی زندگی میں مسرت کا پیغام لاتے ہیں۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ تحقیق ایک ایسی مشترکہ کوشش ہے جس کے طفیل سے دنیا سے دنیا کی تمام قومیں فیضیاب ہوتی ہیں۔تمام علوم وفنون کی حصول یابی میں آسانیاں پیدا ہوتی ہیں۔اس سلسلے میں عبدالرزاق قریشی لکھتے ہیں:

''غرض علوم وفنون کی ترقی تعلیم و تربیت کے ماہرانہ طریقے زندگی کی

راحت کے سامان کی فروانی، انسانی دکھوں کا علاج اور مشکلات کا حل تحقیق ہی کی بدولت ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ تحقیق کا مقصد انسانیت کی خدمت ہے۔'' [اردو میں اصول تحقیق۔ص ۷۶]

یعنی تحقیق کا بنیادی مقصد ترقی کا عمل ہے۔ اسی کے سہارے پوری دنیا آگے بڑھ رہی ہے۔ تحقیق کے مقاصد کو واضح طور پر سمجھنے کے لیے ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش لکھتی ہیں:

(۱) تحقیق کا پہلا مقصد نظریے کی نشو ونما اور ارتقا ہے اس قسم کی تحقیق نئے خیالات کو واضح طور پر متعین کرنے اور مقاصد زندگی کو سمجھنے میں معین و مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی افادیت اشیاء کو تفصیل سے بیان کرنا ہے۔ جو سائنسی طریقوں کی مدد ہی سے ممکن ہے اور اس کے نتائج کا اطلاق ہمیشہ مستقبل پر ہوتا ہے۔ اس قسم کی تحقیق کو نظریاتی یا بنیادی تحقیق کہا جاتا ہے۔

(۲) تحقیق کا دوسرا مقصد حقائق کو ایک جگہ اکٹھا کرنا ہے۔ لہٰذا اس عمل کے لیے یکسر سروے تاریخی تحقیق سے خاص اطلاعات حاصل کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں سائنسی طریقہ تحقیق سے بھی حقائق اکھٹے کیے جاسکتے ہیں۔ اس کو اطلاقی تحقیق کہتے ہیں۔

(۳) تحقیق کا تیسرا مقصد ہے کہ اس کا تعلق فوری اور عملی مسائل سے ہو یا وہ محقق کو سمجھنے یا حل کرنے میں مدد دے سکے۔ اس قسم کی تحقیق سے تعلق رکھنے والوں کو سائنٹفک طریقہ تحقیق سے استعمال کرنا چاہیے تحقیق کے اس مقصد کو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن بالآخر دونوں سطح پر کی جانے والی تجربات کو ہر صورت بہتر بنانا مقصود ہوتا ہے۔ ایسی تحقیق Practical Action Research کہلاتی ہے۔

مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ تحقیق کا اصل مقصد حقائق تک کی رسائی، نئے نظریات کی تشکیل اور انسانیت کی خدمت ہے۔

1.3.5 : تحقیق کے لوازمات

تحقیق کے بنیادی لوازم سے مراد ایسی ضروری شرائط ہیں جو تحقیق کی بنیاد ہوتی ہیں اور جن کا التزام کیے بغیر تحقیقی کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتا ہے۔ محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان شرائط کا خاص خیال رکھے۔ تحقیق کے بنیادی لوازم حسب ذیل ہیں:

(۱) تحقیق کو بطور طرز زندگی اپنانا۔

ایک صادق اور بہترین محقق وہی ہوسکتا ہے جو تحقیقی صلاحیت میں معیار کو برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھے، اور اسے طرز زندگی کے طور پر اپنائے۔ اسے اپنی زندگی میں کوئی اضافی بوجھ نہ تصور کرے۔ کیونکہ اعلیٰ پائے کے محققین نے اپنے زمانے میں ''تحقیقی کام'' کے لئے زندگی کی بہتر عیش وعشرت وسہولیات کو ترک کیا۔ تلاش حقیقت کے لئے شیر کی نہریں نکالیں اپنی علمی زندگی کے آغاز سے محنت ومشقت وجانفشانی کے راستے پر سفر کیا ہے۔ اسی لیے سچے محقق کو اپنے طرز زندگی میں تحقیق کو فیشن کے طور پر نہیں اپنائے۔

(۲) تحقیق سے دلچسپی۔

محقق کو تحقیق سے والہانہ شغف ہونا چاہیے تاکہ تحقیقی کام پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ اگر محقق کو تحقیق میں سنجیدگی اور دلچسپی کی والہانہ لگن نہیں ہے تو محقق تحقیق کا حق ادا نہیں کر پائے گا۔ تحقیق ایک محنت طلب اور مشقت بھرا کام ہے۔ اس راستے میں سفر کرنے سے پہلے محقق کو اپنے اندر تحقیق سے دیوانہ وار عشق کرنا چاہیے۔ تحقیق لگن ہی محقق کی شخصیت کا لازمی وصف ہے۔ تاکہ محقق تحقیق کے تمام تقاضے کو نبھا سکے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ ملک لکھتے ہیں کہ:

> ''جس کو اپنی علمی زندگی کے آغاز میں ایسا راہ نما اور ایسا ماحول مل جاتا ہے کہ وہ سچی لگن میں سازگار ہو اس کے لئے تحقیق کی دشواریاں نسبتاً آسان ہو جاتی ہے۔''
>
> [تحقیق کے بنیادی لوازم در تحقیق اور وضع اصطلاحات، مرتب: اعجاز راہی۔
> مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔ ۱۹۸۶ء صفحہ ۱۲۸]

(۳) مصادر تک رسائی۔

مصادر کسی موضوع پر سب سے قدیم اور بنیادی مواد کو کہا جاتا ہے۔ مواد دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ابتدائی مصادر میں مخطوطات، خودنوشت، سوانح عمریاں خطوط وغیرہ ہوتے ہیں۔ ثانوی مواد میں مضامین یا یونیورسٹیوں میں لکھے

گئے طلباء کے تحقیقی مقالے وغیرہ۔ تحقیقی کام کی ابتدا سے قبل محقق کو ایسے موضوع کو منتخب کرنا ضروری ہے کہ جس پر مصادر اتنی تعداد میں موجود ہوں کہ تحقیقی کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا جا سکے۔ اگر کسی موضوع پر مواد کا فقدان ہے یا محقق کو مواد تک کی رسائی مشکل ہے تو ایسی صورت میں محقق ایسے موضوع کے انتخاب سے گریز کرے۔

(۴) موضوع پر تحقیق ممکن ہو۔

تحقیق کا یہ بنیادی لازمہ ہے کہ محقق ایسے موضوع کا انتخاب کرے کہ وہ اپنے کام کو منزل مقصود تک سرانجام دے پائے۔ کیونکہ تحقیقی کام میں کئی دشواریوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً موضوع پر اٹھنے والے اخراجات کو برداشت نہ کر پانا۔ یا موضوع کے مواد اور اسکی تفہیم و ترتیب اس قدر گنجلک و مشکل ہو کہ محقق کو مواد کو منظّم طور پر ترتیب دینے میں مشکل یا ناممکن صورت حال پیش آئے۔

(۵) موضوع پر پہلے سے تحقیق نہ ہوئی ہو۔

محقق پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایسے موضوع کا انتخاب کرے جس پر پہلے سے تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ گویا موضوع اچھوتا اور نیا ہو۔ اگر انتخابِ موضوع پر پہلے سے تحقیقی کام ہو چکا ہے تو ایسی صورت میں محقق کے سامنے ایک بڑا چیلنج ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح اپنے انتخاب موضوع کو مکمل کر پائے گا۔ ایسے حالات میں وہ اپنی تحقیقی صلاحیت کو بروئے کار لا کر انتخابِ موضوع کے تشنہ پہلو کا مطالعہ کرے اور کچھ نئی جہتوں کو پیش کرے۔

(۶) حصول مواد کے ذرائع سے واقفیت۔

تحقیق کی اہم منزلوں میں مواد کی فراہمی کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ اس کی تلاش اور اس کے ذرائع تک رسائی ہی محقق کے عزم و حوصلے کو بلند کرتی ہے۔ یہاں ذرائع سے مراد لائبریری اور ماہرین علم کے افراد ہیں، جن سے متعلقہ مواد کو حاصل کیا جاتا ہے۔ محقق کو حصول مواد کے ذرائع سے واقفیت اور اس تک رسائی کے عمل میں ماہر ہونا چاہیے۔ کیونکہ لائبریری کے استعمال کرنے کے طریق کار سے بخوبی واقفیت سے محقق کو اپنے حصولِ مواد میں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ محقق علوم و فنون کے ماہرین سے اپنے متعلقہ مواد کے سلسلہ میں رائے مشورہ بھی کرے۔ تاہم محقق کو اپنے تحقیقی کام کی جانب گامزن ہونے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ لکھتے ہیں:

''الجھنیں اور دشواریاں تو اس راہ میں بہت سے آتی ہیں.....اس حالت

سے نکلنے کا آسان ترین راستہ ہے۔جس پر ہم نے اپنے زمانے کے بڑے بڑے فضلاء کو کار بند پایا ہے۔یعنی یہ کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے زیادہ جاننے والے سے پوچھ لیں۔مشورہ اچھی چیز ہے۔اس سے تحقیق کی اکثر مشکلات حل ہوجاتی ہیں۔''

[ایضاً۔۱۳۳،۱۲۳]

(۷) زبانوں سے واقفیت۔

موضوعِ تحقیق کا انتخاب کرنے سے پہلے محقق ان نکات کا خاص خیال رکھے کہ تحقیق کے لئے مطلوبہ زبان کا انتخاب کرے کہ اُسے کس زبان میں تحقیق کرنی چاہیے؟اس سلسلے میں محقق کو بڑی صاف گوئی کے ساتھ کام لینا چاہیے کہ محقق کو کس زبان پر مہارت حاصل ہے۔کیونکہ زبان سے عدم واقفیت یا زبان پر مکمل عبور نہ ہونا۔تحقیقی فہم کے منافی ہے اور تحقیقی کام پر منفی اثرات بھی پڑتے ہیں۔زبان پر معمولی واقفیت سے تحقیقی کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچتا ہے۔محقق کو زبان پر خاطر خواہ مہارت حاصل ہونی چاہیے۔متعلقہ زبان کے علاوہ محقق کو دیگر زبان جیسے عربی، فارسی اور انگریزی وغیرہ سے بھی آشنا ہونا چاہیے۔یہاں آشنائی سے مراد صرف زبان بول چال نہیں ہے، بلکہ ادبی زبان ہے مثلاً محقق اردو زبان میں علوم اسلامیہ پر تحقیقی کام کررہا ہے تو اس کو حدیث یا فقہ کو سمجھنے کے لئے عربی زبان وادب سے بھی واقفیت لازم ہے۔تاکہ تحقیقی تشنگی ادھوری نہ رہ پائے۔

(۸) حقائق کی تلاش اور چھان پھٹک:

تحقیق کا بنیادی مقصد ہی صداقت کی تلاش،حقیقت کی کھوج،اور سچائیوں کو دریافت کرنا ہے۔ان مقاصد کو محقق ایک ہی صورت میں حاصل کرسکتا ہے کہ حاصل شدہ مواد کی خوب چھان پھٹک کرے۔ہر پہلو سے جمع شدہ مواد کا تجزیاتی مطالعہ کرے۔اس کے بعد مقالہ کو تحریر کرے۔اکثر محقق مقالہ کو مکمل کرنے کی عجلت میں اقتباسات کو ترتیب دیتا ہے۔نتیجہ تحقیقی مقالہ کمزور اور نامکمل نظر آتا ہے۔اس سلسلے میں محقق کو غیر جانب دارانہ ہونا چاہیے۔متعلقہ مواد کے ہر پہلو پر شک کی نگاہ ڈالے۔ڈاکٹر گیان چنداس کے متعلق لکھتے ہیں:

''اچھا محقق ہونے کے لئے اچھا مسلک ہونا ضروری ہے اسے انسانوں کی حق گوئی اور ان کے اقوال کی صحت کے بارے میں خراب رائے رکھنی

چاہیے.....

ہم گوشت پوست کے بنے ہوئے فانی انسان ہیں۔ہم سے غلطی ہونا لازمی ہے۔'' [تحقیق کا فن۔۱۸۸]

اس سلسلے میں مصطفیٰ خان یوں رقم طراز ہیں:

''تحقیق کی روح اور جان تو یہی ہے کہ حقائق کی تلاش کی جائے اور اچھی طرح سے ان کی چھان بین کی جائے اور وہ تحقیق بلاشبہ نامکمل ہے۔اگر تعبیر و تشریح کے ساتھ نہ ہو یا باالفاظ دیگر اگر اس کے ساتھ تنقید نہ ہو.....''

[تحقیق کے بنیادی لوازم در وضع اصطلاحات۔ص۱۳۱]

مختصراً طور پر کہا جائے کہ محقق اپنے تحقیقی کام میں اپنی ایمانداری کا ثبوت پیش کرے۔غیر جانبدارانہ و ذاتی جذبات اور تحفظات سے گریز کرے۔تحقیقی عمل میں حقائق کی تلاش ہی بنیادی مقصد ہے۔

(۹) موادکی ترتیب و تنظیم۔

متعلقہ مواد کی حصول یابی اور چھان پھٹک کے بعد اس کی ترتیب کا مرحلہ آتا ہے۔اس مرحلہ میں محقق بڑی سنجیدگی اور لگن کے ساتھ مواد کی ترتیب کے دوران تجزیہ اور دلائل کی روشنی میں ماخذ معلومات کو مدنظر رکھے۔یہاں محقق کو کافی احتیاط برتنے کی ضرورت پڑتی ہے۔غیر ضروری مواد کو تحریری مقالے کا حصہ نہ بنایا جائے۔اس سلسلے میں عبدالرزاق قریشی لکھتے ہیں۔

''سارا ممکن الحصول مواد اکٹھا کر لینے کے بعد اب ضرورت ہے کہ اسے ترتیب دیا جائے۔ یعنی آغاز کار سے اب تک جو نوٹ لیے گئے ہیں انہیں ان کے عنوانات کے تحت مرتب کیا جائے۔ان کو مرتب کرتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ جو غیر اہم یا غیر ضروری نوٹ آ گئے ہیں۔انہیں الگ کر دیا جائے۔

جس طرح نوٹ لیتے وقت با قاعدگی اور احتیاط کا خیال رکھا گیا تھا اسی طرح انہیں

ترتیب دیتے وقت بھی باقاعدگی اور احتیاط ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ جس کام میں تنظیم و ترتیب ہوتی ہے اس کا نتیجہ خاطر خواہ خوشگوار ہوتا ہے۔''

[اردو میں اصولِ تحقیق ۲۶۳]

(۱۰) مقالہ کی تسوید و پیش کش:

منظّم و سہل انداز میں مقالے لکھنا بھی ایک آرٹ ہے۔ اس مرحلے میں محقق کی پاکھی نگاہ، وسعت مطالعہ، محنت و دیانت داری اور ادبی شوق و جنون کا ثبوت ملتا ہے۔ ان امور کے التزام میں محقق کی منفرد اسلوب بھی اجاگر ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر عبدالستار دلوی لکھتے ہیں:

''تحقیق کا موضوع کتنا ہی اہم ہو، اگر اس کی مناسب انداز میں پیش کش نہ ہو سکے تو تحقیقی عمل نامکمل ہی رہتا ہے۔

[اردو میں مقالہ کی پیش کش، در اردو میں اصول تحقیق، ۲۳۷]

ہر محقق چاہتا ہے کہ اس کے تحقیقی کام کی خوب پذیرائی ہو اور اسے ادبی دنیا میں سراہا جائے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لئے محقق کو چند نکات کو پیش نظر رکھنا لازم ہوتا ہے:

(۱) اسلوب بیان سنجیدہ، سادہ اور مؤثر ہو؛

(۲) الفاظ کا صحیح استعمال ہو؛

(۳) اقتباسات کا مناسب استعمال کرے؛

(۴) موضوع سے اخذ کردہ، نتائج کا مختصراً بیان کرے؛

مواد کی ترتیب کے بعد مقالے کو صفحۂ قرطاس میں بکھیرنے کا عمل شروع ہوتا ہے۔ اس آخری عمل کی دو منزلیں ہیں:

(۱) مقالے کا پہلا مسودہ تیار کرنا۔

(۲) پہلے مسودے کی ضروری ترمیم و اصلاح کے ساتھ صاف نقل کرنا۔

1.3.6 : تحقیق کے ذرائع

تحقیق کے بے شمار ذرائع ہیں اس کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔تحقیق کے سفر میں ذرائع ہی محقق کا واحد ہم سفر ہوتے ہیں۔جس کے سہارے محقق اپنا سفر مکمل کر پاتا ہے۔ذرائع کی تعریف مخصوص چند جملوں میں نہیں کی جاسکتی ہے۔ساری دنیا کے علوم کی تحقیقات بغیر ذرائع کے تصور نہیں کی جاسکتی ہے۔لہٰذا ذرائع کی تعریف چند بندھے ٹکے فارمولے میں نہیں کی جاسکتی ہے۔مثلاً ایک تاریخی محقق جب کسی مقام کی کھدائی کرتا ہے تو اس کام میں آنے والے اوزار کدال اور پھاوڑے کی ضرورت پڑتی ہے۔تاریخی محقق کے سامنے یہ تمام چیزیں ذرائع کے دائرے میں آتی ہیں۔جبکہ سائنسی علوم کی تحقیق کرنے والے کو ٹیسٹ ٹیوب سے لیکر بڑی بڑی مشین اور کیمیکل وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے۔یہ تمام آلات سائنسی علوم کے محقق کو اپنے تجربات و تجزیاتی مطالعہ میں بڑی معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔سوشیولوجی کے محقق کو اپنے تحقیقی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے دور دراز کے مقامات سے اعداد و شمار جمع کرتے ہیں۔ان اسکالرز کے سامنے رسل و رسائل ہی تحقیقی ذرائع ہیں۔تحقیق کے ذرائع کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جراثیم اور بیکٹیریا پر کام کرنے والے ماہرین کو گندگی و غلاظت میں مطلوبہ چیزیں تلاش کرنی پڑتی ہیں۔ذرائع کے متعلق مخصوص نظریہ رکھنا تحقیقی منصوبے کے لیے منفی اثرات پڑتے ہیں۔یعنی کسی کے لئے بے کار چیزیں ہی کسی کے لیے کارآمد ہوتی ہے۔لہٰذا ذرائع کے متعلق ماننا ہے کہ اسے مخصوص خانوں میں نہیں بانٹا جاسکتا۔

1.3.7 : تحقیق کی اقسام

تحقیق کے معنی نئے حقائق کی جستجو ہے اس تلاش میں حقائق کی چھان بین کرنا اور اس کی صداقت تک رسائی حاصل کرنا ہے۔اس عمل میں کئی نئے علوم جنم لیتے ہیں۔جیسے نئے مسائل،تصورات،نظریات،مشاہدے وغیرہ۔ان تمام مراحل میں بنیادی مرحلہ تحقیق کے موضوع کا انتخاب ہے۔ماہرین تحقیق نے موضوعات کے حوالے سے تحقیق کے پانچ اقسام کیے ہیں۔

(ا) علمی تحقیق Academic Research:

اس تحقیق میں ایسے موضوعات پر تحقیق کرنا ہے جن پر معلومات علم میں اضافہ کے ساتھ محقق کے نظریے علم میں وسعت پیدا کرے۔یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی کے لئے لکھے گئے مقالے کو اس تحقیق کا حصہ کہا جاسکتا ہے۔اس کے

ذریعہ طلباء اور اساتذہ کے نظیریۂ علم میں Exchange کا ربط قائم ہوتا ہے۔

(۲) سائنسی تحقیق (Scientific Research)

سائنسی تحقیق کا تعلق عموماً سائنسی اداروں میں ضروریات یا موضوعات کے لیے کیا جاتا ہے۔اس تحقیق کا مقصد مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہے۔سائنسی تحقیق کو بڑے منصوبے کے تحت انجام دیا جاتا ہے۔بعض اوقات لسانی تحقیق میں سائنسی تحقیق کے طریق کار کو بھی زیر بحث لایا جاتا ہے۔

(۳) سماجی تحقیق Social Research

سماجی تحقیق انسان کے مجموعی تقاضوں، معاشرے کے عمومی رجحانات اور رویوں پر کی جاتی ہے۔اس تحقیق کا براہِ راست تعلق معاشرے سے ہوتا ہے۔عموماً اس قسم کے تحقیق بڑے بڑے اداروں اور انجمنوں کے ماتحت کیا جاتا ہے۔

(۴) فنسیاتی تحقیق Technological Research

جدید ترقیاتی انجیرنگ اور فنسیاتی سسٹم میں وسعت دینے کے لیے فنسیاتی تحقیق کی جاتی ہے۔صنعت وحرفت کے تقاضوں اور ترقی یافتہ بنانے میں فنسیاتی تحقیق مخصوص ہے۔اس قسم کے تحقیق کے ذریعہ صنعت وحرفت کی پیداوار کے حالات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔فنسیاتی تحقیق سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں بڑے پیمانے پر کی جاتی ہے۔اس قسم کی تحقیقات میں اخراجات بہت ہوتے ہیں۔تحقیق کے اقسام میں فنسیاتی تحقیق سب سے مہنگی ہے۔

(۵) تعلیمی تحقیق Educational Research

اس تحقیق سے مراد وہ تحقیق ہے جو تعلیمی اداروں میں یونیورسٹیوں اور تعلیمی ریسرچ سینٹر میں کروائی جاتی ہے۔ اس قسم کے تحقیق میں موضوعات بیشتر انفرادی ہوتے ہیں۔بعض اوقات اجتماعی سطح پر بھی تحقیق کی جاتی ہے۔اس سلسلے میں عبدالرزاق قریشی لکھتے ہیں:

> ''انسان کی زندگی میں تنوع ہے اس لیے اس کے مسائل میں بھی مثلاً علمی مسائل، معاشرتی مسائل، تعلیمی مسائل وغیرہ چونکہ مسائل میں تنوع ہے اس لیے موضوعات تحقیق میں بھی تنوع ہے۔'' [فنِ تحقیق مشمولہ اردو میں اصول تحقیق۔۸۱]

تعلیمی تحقیق میں زبان وادب کے حوالے سے ماضی کی گم شدہ کڑیوں کی بازیافت ہوتی ہے۔لسانی نقطہ نگاہ سے تعلیمی تحقیق ادب کی ارتقائی شکل ہے۔زبان وادب کے آغاز وارتقاء عہد بہ عہد اور رجحانات کے تقاضوں کو تعلیمی تحقیق کے ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

''خاص اردو تحقیق کی تقسیم کرنا چاہیں تو بڑے بڑے زمرے بنانے ہوں گے جو ایک طرح سے دیکھے تو موضوعات کے گٹھے ہوں گے ہم ذیل کے زمرے کر سکتے ہیں:

(۱) سوانحی وتاریخی تحقیق: اس میں کسی ادیب یا صنف کے اہم تخلیق کاروں کی تصانیف پر تحقیقی بحث کی جاتی ہے۔جن کے اندر بہت کچھ تاریخ جیسا ہوتا ہے۔

(۲) تنقیدی تحقیق: یونیورسٹیوں کے قوانین تحقیق میں جو ایک مشق ہوتی ہے پرانے یا معلوم حقائق کی نئی تشریح اس کے سایہ دامن میں تنقید تحقیق میں دراندازہو جاتی ہے۔

(۳) تدوین تحقیق

(۴) حوالہ جاتی تحقیق مثلاً وضاحتی فہرستیں، اشاریے، انسائیکلو پیڈایا، قواعد ولغات وغیرہ تیار کرنا، قواعد ولغات وغیرہ تیار کرنا۔

(۵) بین العلومی تحقیق: اس میں ادب اور کسی دوسرے مضمون مثلاً لسانیات، تاریخ، سیاسات، سماجیات، معاشیات وغیرہ کے مشترکہ موضوعات پر تحقیق کی جاتی ہے۔'' [تحقیق کا فن۔۱۹]

موضوع کے اعتبار سے ان پانچ قسموں کی تحقیق حسب ذیل تقسیم سے وابستہ ہوتی ہے یعنی

(الف) بالواسطہ تحقیق Direct Research

(ب) بلاواسطہ تحقیق Indirect Research

بالواسطہ تحقیق میں محقق اپنے موضوع تحقیق کے لئے مواد جمع کرتا ہے، اور جمع شدہ مواد میں حقائق کی چھان بین کرتا ہے۔اس طریقے کار میں محقق تمام ذاتی کوششوں کو شامل کرتا ہے۔جبکہ بلاواسطہ تحقیق میں حاصل کردہ معلومات میں محقق حقائق کی کسوٹی پر پرکھتا ہے یعنی جمع شدہ معلومات میں تجزیاتی مطالعہ کرتا ہے اور اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔

1.4 : خلاصہ

تحقیق کی ضرورت واہمیت کا اندازہ ہمیں انسانی تہذیب کی ابتدا سے رہا ہے۔ دنیا کے تمام علوم وفنون کی ترقی کا زینہ تحقیق ہے۔ زندگی کے تمام شعبے حیات کی خوشحالی اور ترقی تحقیق کے بدولت سے ہے۔ گویا تحقیق ہماری زندگی میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ قدرت کے بے شمار پوشیدہ خزانوں کی دریافت اور اس کے رازوں کو جاننے کی خواہش و تجسس انسانی فطرت میں رہی ہے۔ ان رازوں سے پردہ اُٹھانے کے لیے انسان نے ''تحقیق'' کی پرخطرناک راہوں کا سفر کیا۔ بعض مقامات میں اپنے کو ثابت قدم پایا۔ ریل گاڑی کی تیز رفتار سے لیکر خلائی رفتار کو تحقیق کے طفیل سے طے کیا ہے۔ تحقیق کے ذریعہ نت نئے دریافت وانکشافات نے انسانی طرز زندگی کو بے حد خوشگوار اور پرمسرت بانے میں کلیدی رؤل ادا کیا ہے۔ یعنی تحقیق انسانی تہذیب کی بے لوث خدمات وانسانیت کا درس دیتی ہے۔ اس کی ضرورت و اہمیت نے معاشرے میں بڑا انقلاب برپا کیا ہے۔ بجلی کی سفید روشنی سے لیکر انٹرنیٹ کی رفتار نے پوری دنیا کو Global Milla میں تبدیل کر دیا ہے۔ میڈیکل سائنس کے نئے نئے تجربات ومشاہدات نے بہت ساری خطرناک بیماریوں کا علاج کیا۔ گویا تحقیق نے انسانی معاشرے کی فلاح و بہبود کی پوری ذمہ داری اپنے کاندھوں میں لے رکھی ہے۔

تحقیق کا بنیادی مقصد صرف ترقی کا عمل ہے۔ اس عمل میں کئی ایسے مرحلے آتے ہیں جن پر محقق کو چلنا دشوار گزار ہوتا ہے۔ لہٰذا محقق کو حوصلہ اور پرعزم ارادے کے ساتھ تحقیقی میدان میں قدم رکھے۔ اور اپنے تحقیقی کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے چند خاص نکات کو مدنظر رکھنا لازم ہے۔ مثلاً تحقیق کو بطور طرز زندگی اپنانا، تحقیق سے دیوانہ وار عشق کرنا۔ حقائق کی تلاش اور چھان بین میں ذاتی جذبات واحساسات اور جانب داری جیسے عناصر سے گریز کرے۔

مختصراً تحقیق کی ضرورت واہمیت اور اس کے لوازمات میں بنیادی بات یہ ہے کہ صداقت کی تلاش، حقائق کی کھوج، تجسس وجستجو کے جذبات کا بھرپور استعمال کرے۔ تاکہ ایک نئے پہلو یا نظریہ عیاں ہو جو سماج قوم اور ملک کی بہتری اور خوشحالی اور ترقی کا ضامن بنے۔

1.5 : نمونے کے امتحانی سوالات

(۱) تحقیق کسے کہتے ہیں؟ مثال کے ذریعے پیش کیجیے۔

(۲) تحقیق کی اہمیت اور افادیت بیان کیجیے؟

(۳) تحقیق سے کیا مراد ہیں؟ واضح کیجیے۔

(۴) تحقیق کے بنیادی مقاصد سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔

(۵) تحقیق کے بنیادی لوازمات کا مختصراً جائزہ لیجیے۔

(۶) تحقیق کے کتنے اقسام ہیں اور اسکی ضرورت کیوں ہے؟

1.6 : فرہنگ

الفاظ	:	معنی
صداقت	:	سچائی،خلوص، وفاداری،ثبوت، گواہی
تجربات	:	آزمائش،امتحان، جانچ پرکھ
تصدیق	:	صداقت، سچ ہونے کی تائید
تحریک	:	حرکت دینا، ملانا، کسی بات کو شروع کرنا
مفروضات	:	فرض کیا ہوا، وہ بات جو استدلال کی بنیاد کے طور پر مان لے
فرضیات	:	فرض ہونا، لازم،ضروری
معروضی	:	خارجی، واقعی
مدلل	:	دلیل سے ثابت کیا ہوا۔معقول،ٹھیک، درست
انکشافات	:	کھولنا، ظاہر ہونا
اُسلوب	:	طریقہ،طرز، روش،جمع اسالیب

1.7 : سفارش کردہ کتابیں

۱۔	تحقیق کا فن۔	ڈاکٹر گیان چند
۲۔	محقق اور مدون	رشید حسن خان
۳۔	تحقیق روایت، تدوین	رشید حسن خان
۴۔	تاریخ ادب اردو	جمیل جالبی
۵۔	تحقیق سے تدوین کے اصول وطریقہ کار	ڈاکٹر بلقیس بیگم

باب : دوم

تحقیق اور طریقہ کار

2.0 **اجزاء**

2.1 مقاصد

2.2 تمہید

2.3 موضوع کی وضاحت

2.3.1 انتخابِ موضوع کا تعارف

2.3.2 انتخابِ موضوع کے طریقہ کار

2.3.3 انتخابِ کے وسائل اور ذرائع

2.3.4 موضوع کی شرائط

2.4 خاکہ کی تعریف

2.4.1 : خاکہ کی اہمیت وافادیت

2.4.2 : خاکہ کی تیاری کے عناصر

2.5 خلاصہ

2.6 نمونے کے امتحانی سوالات

2.7 فرہنگ

2.8 سفارش کردہ کتابیں

2.1 : مقاصد

اس باب کے مطالعہ کے بعد طلباء سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ.....

☆ انتخاب موضوع کے تعارف سے واقف ہو سکے گے۔

☆ انتخاب موضوع کے طریقہ کار سے واقف ہو سکے گے۔

☆ خاکہ کے معنی مفہوم واضح کرسکیں گے۔

☆ خاکہ کی کیا اہمیت وافادیت بیان کرسکیں گے۔

☆ خاکہ تیار کرتے وقت کن عناصر کی ضرورت پیش آتی ہیں۔ اس سے واقف ہوسکیں گے۔

☆ خاکہ بنانا کیوں ضروری ہے؟ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرسکیں گے۔

2.2 : تمہید

جس طرح کسی منزل تک پہنچنے کے لیے راستوں اور ذرائع سفر کے انتظامات کرنے پڑتے ہیں،ٹھیک ویسے ہی تحقیقی کام کے لیے موضوع کا انتخاب پہلا زینہ ہوتا ہے۔شوقیہ تحقیق کرنے والوں کے لیے موضوع کے انتخاب میں مبہم ہوتا ہے۔جبکہ جامعات میں ایم۔فل۔پی ایچ ڈی کرنے والے ریسرچ اسکالر کے لیے موضوع کا انتخاب بڑی اہمیت رکھتا ہے۔اس مرحلے میں محقق کی صلاحیت، مذاق اور پسند واضح طور پر نظر آتی ہے۔کیونکہ تحقیق ایک ایسا گہرا سمندر ہے جس کے اندر بے شمار نادر و نایاب موتی بکھرے پڑے ہیں۔ان موتیوں کو چن کر نکالنا جوئے شیر لانے کے برابر ہیں۔لہٰذا موضوع کا انتخاب تحقیق کی سب سے اہم منزل ہے۔کسی بھی علمی تحقیق کو مکمل کرنے کے لیے ''موضوع کا انتخاب'' محقق کے لیے پہلا مقصد ہوتا ہے۔موضوع کے متعلق اسکالر کا ذہن صاف اور سنجیدہ ہونا چاہیے۔کیونکہ اس مرحلے میں محقق کو کئی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔مثلاً انتخاب موضوع کے لیے وسائل تک رسائی، خاکہ کو کس طرح تیار کیا جائے،موضوع کی اہمیت وافادیت کیا ہے؟ موضوع کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے کیا کیا طریقہ کار اپنائے؟ وغیرہ وغیرہ اس قسم کے کئی سوالات محقق کو اپنے تحقیقی عمل میں پیش آتے ہیں۔لہٰذا موضوع کا انتخاب تحقیقی عمل کا مرکزی نقطہ ہے۔محقق اس بات کا بڑی احتیاط سے خیال رکھے کہ کسی بھی تحقیقی کام کی ابتداء سے قبل موضوع یا عنوان کے متعلق چھان بین کرلیا جائے۔

تحقیقی کام کا آغاز خاکہ کی تیاری سے ہوتا ہے۔کسی بھی تحقیقی موضوع کی تکمیل سے پہلے خاکہ بنانا پڑتا ہے۔ خاکہ تحقیقی منصوبے کا ابتدائی مرحلہ ہوتا ہے یعنی موضوع کے تعلق سے جو تحقیقی مقالہ اسے لکھنا ہوتا ہے اسے Synopris کہا جاتا ہے۔اس سلسلے میں محقق کا مطالعہ اور اسکی تحقیقی صلاحیت کا امتحان ہوتا ہے۔خاکہ بنانا ایک بڑا مشکل فن ہے۔کیونکہ پوری تحقیقی منصوبے کی عمارت اس اساس پر کھڑی ہوتی ہے۔گویا خاکہ بنانا تحقیقی کام کی شروعات کی پہلی منزل ہوتی ہے۔خاکہ بنانے میں یا تحقیقی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں کئی قسم کے طریقۂ کار اور اصول کی

ضرورت پڑتی ہے۔ خاکہ اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ محقق کا مطالعہ کتنا وسیع ہے۔ یونیورسٹیوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طالب علم کو اپنے تحقیقی منصوبے کیلئے خاکہ بنانے کے طریقۂ کار پر کورس ورک کرایا جارہا ہے۔ اس کورس ورک کے ذریعہ اسکالر کو درس دیا جاتا ہے کہ تحقیقی منصوبے میں خاکہ کی کیا اہمیت ہے؟ اس کے علاوہ کسی بھی ریسرچ کام کے لیے خاکہ کی تیاری لازم ہے۔ خاکہ کی تیاری کے دوران عمل میں کون کون سے نکات کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً ادبی تحقیقی مقالے لکھنے کے کتنے صفحات کی تعداد مقرر یا نہیں۔ سائنسی مقالے لکھنے کے صفحات کی قید مقرر ہے یا نہیں؟ اس طرح کے سوالات اسکالر کے سامنے آتے ہیں۔ خاکہ کی تیاری اور اس کے متعلق تمام پہلوؤں پر تفصیل سے ذیل میں گفتگو کی گئی ہے۔

2.3 : موضوع کی وضاحت

2.3.1 : انتخاب موضوع کا تعارف

تحقیق کا سب سے پہلا اور اہم مرحلہ انتخابِ موضوع ہے۔ یہ مرحلہ طالب علم کے لیے انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ اگر محقق صحیح طور سے موضوع کا انتخاب کرے تو گویا نصف تحقیقی کام ہوگیا۔ انتخاب موضوع کے لیے طالب علم کو اپنے موضوع کا انتخاب کرتے وقت گنجلک اور پیچیدہ اور غیر واضح موضوعات سے اجتناب برتنا چاہیے انتخاب موضوع کے مفہوم کو آسان زبان سمجھنے کے لیے ذیل کے نکات کو مدنظر رکھا جائے تا کہ انتخاب موضوع محقق کے لیے دردسر نہ بنے۔ بقول ڈاکٹر عبدالمجید خان عباسی کہ:

(۱) موضوع صاف اور واضح ہو اس میں کسی قسم کا ابہام نہ ہو۔

(۲) طالب علم موضوع پر کافی عبور رکھتا ہو اور موضوع کی تعریف اور تشریح و توضیح سے بخوبی طور پر واقف ہو۔

(۳) موضوع اتنا پھیلا ہوا نہ ہو کہ اس پر قابو نہ پایا جاسکے۔

(۴) ابتدائی طور پر تحقیق کر کے اچھی طرح سے یہ دیکھ لیا جائے کہ موضوع پر وافر مقدار میں مواد ہے یا نہیں؟

(۵) کسی ایسے موضوع پر کام نہیں کرنا چاہیے جس پر بنیادی مواد ہی دستیاب نہ ہو۔

(۶) موضوع ہمیشہ نیا ہونا چاہیے۔ پرانے موضوعات کو دہرانا بے سود ہے۔

(۷) موضوع اسی صورت میں افادیت کا حامل ہوگا کہ اس سے تاریخ ادب کے کسی گوشے پر نئی روشنی پڑتی ہو۔

(۸) محقق میں تحقیق کا ذوق وشوق ہو اور جس مسئلہ (موضوع) پر وہ کام کرے اس کے ساتھ اس کی دلچسپی ہو۔

(۹) محقق کا ذہن بالکل غیر جانبدار ہو۔ اس میں کسی قسم کا ہلکا سا تعصب یا جانبداری کا رویہ نہ ہو۔ کیونکہ یہ دونوں باتیں محقق کے لیے زہر قاتل ہیں۔

(۱۰) مسئلے (موضوع) کے انتخاب میں محقق کا رویہ معروضی ہونا چاہیے۔ وہ پہلے سے کوئی نقطہ نظر لے کر نہ چلے بلکہ حقائق کی مدد سے کسی مسئلے کا تعین کرے۔

(۱۱) محقق نے تحقیق کے لیے جو مسئلہ منتخب کیا ہے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے جس فنی مہارت، قابلیت اور استعداد کی ضرورت ہوسکتی ہے وہ محقق میں ضرور موجود ہونی چاہیے۔

(۱۲) تحقیقی مسئلے کے انتخاب میں محقق کو اپنی صمت وقت اور مالی وسائل کو بھی دیکھنا چاہیے تاکہ کام شروع کرتے وقت وہ یکسوئی اور اطمینان سے تحقیق کر سکے۔

(۱۳) اگر محقق کسی دانش گاہ میں مقالہ پیش کرنے کے لیے مسئلہ کا انتخاب کر رہا ہے تو پھر یہ بھی دیکھا جائے کہ مسئلہ دانش گاہ کے معیارات پر پورا اترتا ہے یا کہ نہیں؟

(۱۴) کسی دانش گاہ (یونیورسٹی) میں مسئلہ پیش کرنے سے قبل یہ دیکھ لیا جائے کہ اس ادارے میں راہنمائی کے لیے ماہرین موجود ہیں یا نہیں؟

(۱۵) علاوہ ازیں! موضوع ایسا ہو کہ اشاعت کے بعد خاص وعام دونوں نوعیت کے قارئین کی اس میں دلچسپی ہو۔

(۱۶) بین العلومی موضوعات شاندار سمجھے جاتے ہیں۔ ان سے مراد وہ موضوعات ہوتے ہیں جن میں اردو ادب کے علاوہ کسی اور مضمون یا علم کی معلومات ہوتی ہیں۔

(۱۷) موضوع خالص تنقیدی نہ ہو۔ کیونکہ خالص تنقید کو تحقیق کا نام دینا مناسب نہیں ہے۔

(۱۸) موضوع پر پہلے کام نہ ہو چکا ہو بلکہ ہو بھی نہ رہا ہو۔

(۱۹) اس موضوع کو اختیار نہیں کرنا چاہیے جس پر محقق نے خود پہلے مقالہ لکھا ہوا ہے۔ جیسے ایم فل کے موضوع کو پی ایچ ڈی کے لیے اختیار کرنا۔

(۲۰) موضوع زیادہ عمومی نہ ہو۔ کسی بڑے مصنف کی پوری زندگی اور جملہ تصانیف کو لے لینا بھی عمومی جائزہ بن کر رہ جائے گا۔ مثلاً اقبال کو پورے کا پورا لے لیا جائے تو بہت سرسری کام ہوگا۔ اس میں گہرائی نہ ہوگی۔

(۲۱) جن شخصیتوں یا موضوعات پر بے خوفی سے نہ لکھا جائے، ان کو نہیں لینا چاہیے۔

(۲۲) کسی زندہ شخص پر کسی مصلحت یا مفاد کی خاطر تحقیقی کام نہیں کرنا چاہیے۔

(۲۳) زیادہ حالیہ موضوع سے احتراز مناسب ہے کہ اس کا مواد رسالوں ہی میں مل سکتا ہے کتابوں میں نہیں

(۲۴) زیادہ تکنیکی موضوع بھی آخر کار الجھن کا باعث ہوسکتا ہے۔ مثلاً اردو عروض کا تاریخی وتنقیدی جائزہ۔

(۲۵) مناظراتی موضوع بھی مناسب نہیں ہوتے۔

(۲۶) اگر کوئی ایسا موضوع لینا ہے جس میں کسی دوسری زبان کی معلومات بھی درکار ہوں تو تا وقت کہ اس زبان سے کما حقہ واقفیت نہ ہو اسے نہیں لینا چاہیے جیسے ''اردو تنقید پر عربی تنقید کا اثر'' وغیرہ۔

2.3.2 : انتخاب موضوع کے طریقہ کار

عام طور پر انتخاب موضوع کے لیے دو طریقہ کار رائج ہیں:

(الف) محقق کی طرف سے موضوع کا انتخاب۔

(ب) نگران استاد کی طرف سے انتخاب موضوع۔

☆ (الف) محقق کی طرف سے موضوع کا انتخاب۔

یہ طریقۂ کار زیادہ بہتر اور مفید ہوتا ہے کیونکہ محقق کو یہی تحقیقی مقالہ تحریر کرنا ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال میں پوری تحقیق کی ذمہ داری محقق کے سر پر ہوتی ہے۔ لہٰذا محقق اپنی پسند کے مطابق تحقیقی موضوع کا انتخاب کریں۔ اس کی وجہ یہ

ہے کہ اسکالر اپنے تخصص کو وسعت دے سکتا ہے اور اس پر Authority بھی حاصل کر سکتا ہے۔اس کے علاوہ اسکالر اپنے موضوعِ انتخاب میں اپنے اساتذہ سے بھی مشورہ کر سکتا ہے۔

☆ (ب) نگراں استاد کی طرف سے انتخاب موضوع:

جب طالب علم کورس ورک کے دوران موضوع کا انتخاب کرنے کا فیصلہ نہیں کر پاتا ہے تو ایسی صورت میں نگراں استاد اپنی طرف سے موضوعِ انتخاب کرتے ہیں۔ کیونکہ نگران استاد کے پاس کئی اہم موضوعات ہوتے ہیں جو تحقیق کے لیے مناسب ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ اسکالر کو اپنے موضوعِ تحقیق کے متعلق واضح انداز سے سمجھنے کا بھرپور موقع ملتا ہے۔

2.3.3 : انتخاب موضوع کے ذرائع ووسائل

اسکالر کو اپنے موضوع کے انتخاب کے لیے مختلف ذرائع ووسائل سے مدد لینی پڑتی ہے۔ذیل میں ان ذرائع کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) ذاتی معلومات:

طالب علم یا اسکالر کے ذہن میں ہمہ وقت کچھ ایسے سوالات ابھرتے رہتے ہیں جن کے جواب کی تلاش میں وہ بھٹکتا رہتا ہے۔بعض دفعہ اسکالر کا مطالبہ اتنا وسیع ہوتا ہے کہ وہ اپنے مطالعہ کے بناء پر تحقیقی موضوع بنا سکتا ہے یا کوئی ایسا مسئلہ ہو جو اسکالر کو ہمہ وقت پریشان کرتا ہو۔ایسی صورت حال میں اسکالر اپنے ذاتی تجربہ اور مطالعہ کے توسط سے موضوع کا انتخاب کرتا ہیں جس سے تحقیقی کام کو بڑی سہولت وآسانی کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچانے میں مدد ملتی ہے۔

(۲) دوسروں سے گفتگو:

تحقیق کو مخصوص نظریئے میں قید نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہر چیز کی تحقیق قابل قبول ہوتی ہے۔طالب علم دوسروں کے ساتھ گفت وشنید کے ذریعہ نئے نئے تحقیقی موضوعات سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے کیونکہ علمی گفتگو کے ذریعہ کئی نئی باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ یا کئی نئی سوچ، نیا نظریہ یا مسئلہ سامنے آتا ہے۔لہٰذا اسکالر اپنے موضوع کا انتخاب اس ذرائع سے بھی حاصل کر سکتا ہیں۔مثال کے طور پر ایم اے کا طالب علم اپنے اساتذہ سے تحقیق کے متعلق یعنی پی ایچ ڈی کرنے سے قبل کئی موضوعات پر گفتگو کرتا ہے اس دوران نگراں کے Body Language یا چہرے کے تاثرات

وغیرہ سے کئی نئی سوچ کی کرنیں ہیں۔ گویا گفتگو کے وسیلے سے تحقیق کے ہزار موضوعات کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔

(۳) غور وفکر اور سوچ بچار:

اسکالر اپنے اردگرد موجود کائنات کے بارے میں غور وفکر کرے، اپنے اردگرد کے لوگوں، معاشرے، سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی حالات کے متعلق سوچیں، نباتات حیوانات اور جمادات پر بھی غور وفکر کرے اس طرح سے کئی نئی فکر ابھر کر سامنے آتی ہے۔

مثلاً کسی واقعات کے پس منظر اسباب اور اس کے نتائج کے بارے میں ہر رویے سے سوچے۔ ان غور وفکر کے مرحلے میں اسکالر کے اندر فرق اور تشابہات کا فن پیدا ہوتا ہے۔ اور ان فرق وتشابہات کی بنا پر اسکالر کا ذہن تقابل کی جانب منتقل ہوتا ہے۔ اس طرح سے اسکالر ایسی نئی چیزوں یا مسائل کے متعلق بالکل نئے انداز سے غور وفکر کرنے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر ملکوں اور اقوام کے ماضی کے حالات وواقعات پر مطالعہ کرے اور ان واقعات کو حال ومستقبل کی روشنی میں غور وفکر کرے کہ کیا نئے نئے امکانات یا مشکلات سامنے آسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے روشن دماغ کے ساتھ مستقل مسئلہ کا حل بھی پیش کرے۔ گویا اسکالر کے سامنے ماضی حال اور مستقبل کی ایک مکمل تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ جو تحقیق کے لیے کارآمد ہوتی ہے۔

(۴) ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی خبریں:

اس جدید آلات میں دن بھر دنیا کے ہر کونے میں ہونے والے واقعات وحادثات کی خبریں ہم تک پہنچتی ہیں۔ اسکالر کے لیے یہ خبریں بڑی اہم ہوتی ہیں۔ یعنی سیاسی، جنگی، اقتصادی، معاشرتی، تعلیمی اور دینی ہر طرح کی خبروں میں بے شمار مسئلہ پائے سوال پوشیدہ ہوتے ہیں۔ جو تحقیق کے موضوعِ انتخاب بن سکتے ہیں۔ بلاشبہ خبریں اسکالر کے ذہن اور دل میں کئی تازہ سوالات کو جنم دیتی ہیں بشرط کہ محقق ان خبروں کو غور سے سنے اور اس پر فکر کرے۔ نتیجہ اسکالر کے سامنے کئی موضوعات تحقیق کی رہنمائی کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔

(۵) اخبارات اور مجلّات:

ہم سبھی روز اخبارات ومجلّات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان اخباروں میں بہت اہم مسائل کو موضوع بناتے ہیں۔ مثلاً فیچرز، کالمز، رپورٹ، اداریہ وغیرہ میں کئی پوشیدہ مسئلہ، سوچ، سوالات ہوتے ہیں جو تحقیق کے موضوع کے لیے واشگاف ہوئے۔ بشرط یہ کہ اسکالر بڑی باریک بینی سے دیکھے اور ہر واقعہ اور ہر منظر کے بارے میں تجسس وجستجو کا جذبہ

رکھے۔مثال کے طور پر لاکھوں لوگوں نے درخت سے سیب کو گرتا ہوا دیکھا لیکن سائنس دان نیوٹن نے درخت سے سیب گرنے کا سبب دریافت کیا۔نتیجہ کشش ثقل کا قانون دریافت ہوگیا۔اس مرحلے میں غور وفکر،سوچیں،تحقیق موازنہ و مقابلہ،تجزیہ واستنباط کا جذبہ وجستجو کارفرما تھا۔لہٰذا اسکالر اخبارات اور تحقیقی مجلّات ورسائل میں بھی تحقیق کا موضوع تلاش کرسکتا ہیں۔ہر خبر کو غور سے پڑھے کیونکہ ہر پہلو میں تحقیق کے امکانات ہوتے ہیں۔

☆ **محاضرات ودروس:**

یونیورسٹی میں ہونے والے سمینار یا محاضرات وغیرہ میں اسکالر شرکت کرے اور ان پروگرام میں ہونے والے محاضرات کو غور سے سنے۔اساتذہ کرام کے لیکچرز میں کئی نئی سوچ ملتی ہیں۔جو تحقیق کے میدان کے لیے سودمند ثابت ہوتی ہیں۔لہٰذا اسکالر اہل علم کی باتیں تیز سماعت میں سنے۔کیونکہ کئی ایسی باتیں جو لاعلم میں سماعت سے ٹکراتی ہیں اور تحقیق کا سبب بن جاتی ہے۔

2.3.4 : موضوع کے شرائط

تحقیق ایک ایسی راہ ہے جس میں پھول کم،خار زیادہ ملتے ہیں۔تحقیق کے انتخاب موضوع اس مرحلے کی پہلی سیڑھی ہوتی ہیں۔محقق کو اپنے تحقیق کے موضوع کے ہر پہلو سے آشنائی ضروری ہے۔اچھے موضوع کے انتخاب کے بھی چند شرائط ہوتے ہیں۔ذیل میں اہم شرائط کا ذکر کیا گیا ہے:

(۱) جدت وتخلیق:

موضوع کی جدت ہی تحقیق کی جستجو کو مزید تقویت بخشتی ہے۔اچھوتا اور انوکھا موضوع تحقیق کے حسن کو دوبالا کردیتا ہے۔اس سلسلے میں اسکالر خاص خیال رکھے کہ اس موضوع پر پہلے بھی کام ہوا ہے یا رجسٹریشن کیا گیا ہے۔اس کی جانکار حاصل کرلے پہلے سے کیے ہوئے موضوع پر کام کرنے سے پرہیز کرے۔کیونکہ یہ علمی وادبی سرقہ اور خیانت کا اقدام ہوتا ہے۔

(۲) دلچسپی ورغبت:

موضوع تحقیق کا دارومدار محقق کی دلچسپی ورغبت پر منحصر ہے۔لہٰذا محقق اپنے تحقیق کے لیے ایسا موضوع کا انتخاب کرے جس میں ذاتی دلچسپی اور شوق ہو،تاکہ وہ اپنے تحقیقی منصوبے کو محنت ومشقت کے ساتھ مکمل کرنے میں کامیاب ہوسکے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر احمد کا کہنا ہے کہ محقق اپنے موضوع تحقیق سے کتنی رغبت و دلچسپی رکھتا ہے۔ ذیل میں چند سوالات کو مد نظر رکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔

(۱) کیا میں اپنے موضوع کو پسند کرتا ہوں؟ کیا اس میں میری رغبت ہے؟ کیا یہ میرے لئے اس قدر دلچسپ ہے کہ میں اس پر محنت کرسکوں؟

(۲) کیا مجھ میں اس عمل تحقیق کو سرانجام دینے کی صلاحیت واستعداد ہے؟

(۳) کیا اس موضوع پر تحقیقی مقالہ تیار کرنا ممکن بھی ہے؟

(۴) کیا موضوع اس قابل ہے کہ اس پر ذہنی وجسمانی اور مالی محنت صرف کی جائے؟

(۵) کیا اس موضوع پر مقررہ مدت کے دوران مقالہ تیار کرنا ممکن ہے؟

(۶) کیا اس موضوع کا پوری طرح استیعاب ممکن ہے؟ کیا اس موضوع پر مواد کی وافر فراہمی ممکن ہے؟

مذکورہ بالا سوالات محقق کو اپنے تحقیقی مقالہ تحریر کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

(۳) جامعیت اور وضاحت:

محقق اپنے موضوع تحقیق کے متعلق بالکل واضح تصورات و خیالات ونظریات کا حامل ہو۔ موضوع کا اساسی مقصد افکار، کی گہرائی کے متعلق اسکالر کا نظریہ صاف ودلکش ہونا چاہیے کسی قسم کی پیچیدگی اور غموض موضوع میں نہ ہو۔

(۴) لفظی تحریر:

تحقیق کا عنوان اتنا لمبا نہ ہو کہ نگراں اساتذہ سمجھ نہ پائے اور اتنا مختصر بھی نہ ہو کہ واضح نہ ہوسکے۔ لہٰذا اسکالر کو اپنے عنوان تحقیق کو تحریری شکل دیتے وقت الفاظ کی تحریر کا خیال رکھنا چاہیے۔

(۵) مصادر و مراجع کی دستیابی:

اسکالر اپنے انتخابِ موضوع سے پہلے موضوع کے مصادر کی دستیابی کا تعین کرلے۔ محقق کو ایسے موضوع کا انتخاب نہیں کرنا چاہیے کہ جس میں مصادر کی قلت ہو اور دستیابی سے بالاتر ہو۔ کیونکہ ایسے موضوعات میں صرف محنت اور وقت ضائع ہوتا ہے۔

(۶) مدت تحقیق کا لحاظ:

اسکالر اس امر کا خاص خیال رکھے کہ مقالہ کی تیاری اور جمع کروانے کی مقررہ مدت کے اندر اپنا کام مکمل کرلے۔ ایسا

موضوع کا انتخاب نہ کرے جس کی معلومات حاصل کرنے میں سال لگ جائیں۔ جامعیات میں ریسرچ کرنے والوں پر وقت کی پابندی کی قید ہوتی ہیں۔ان نکات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے تحقیقی کام کو تکمیل کرے۔

(۷) مقالے کی طوالت:

موضوع کے انتخاب کی یہ شرط لازم ہے کہ مقالہ کمپوزنگ کے بعد مقررہ صفحات تک محدود رہے۔بعض دفعہ اسکالر اپنے مقالے کے حجم کا وزن بڑھانے کے لیے غیر ضروری باتیں یا اقتباس وغیرہ نقل کرتا ہے نتیجہ تحقیق کم علمی کے درجے میں شمار ہوجاتی ہے۔

(۸) معاشرتی مقبولیت:

انتخاب موضوع کی یہ بھی شرط ہوتی ہے کہ اسے معاشرتی مقبولیت کا شرف حاصل ہو۔طالب علم ایسے موضوع کا انتخاب کرے جو معاشرے اور قوم دونوں میں احترام کا درجہ رکھتا ہو۔

(۹) اخراجات:

کسی بھی تحقیقی کام میں اخراجات ایک اہم حصہ ہوتا ہے۔اس سلسلے میں اسکالر بے حد خاص خیال رکھے کہ ایسا موضوع کا انتخاب نہ کرے کہ اس کی تکمیل کے لیے زیادہ سرمایہ درکار ہو۔

2.4 : خاکہ کی تعریف

عربی زبان میں خاکہ کو ''خطۃ'' کہا جاتا ہے۔انگریزی میں synopsis کہتے ہیں۔اس لفظ کے لغوی معنی ہیں ''ایک ساتھ نظر ڈالنا'' syn کے معنی ''ایک ساتھ'' اور spsis کے معنی دیکھنا کے ہیں۔تحقیقِ موضوع کے لیے ابواب، فعول اور مباحث وغیرہ کی تقسیم ہوتی ہے جسے خاکہ یعنی Outline کہتے ہیں۔یعنی تحقیقی موضوع کو صفحہء قرطاس پر بکھیرنے سے قبل ایک outline تیار کرنا پڑتا ہے۔مثلاً کسی عمارت کی تیاری سے قبل انجینئر نقشہ کا ماسٹر پلان تیار کرتا ہے۔ٹھیک ویسے ہی تحقیقی موضوع پر کام کرنے کے طریقۂ کار کا نقشہ تیار کیا جاتا ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر گیان چند کا ماننا ہے کہ خاکہ مختلف تصورات کی تقسیم، ترتیب اور باہمی رشتے کا نام ہے۔کتاب ہی میں نہیں، زندگی کے ہر شعبے میں کام سے پہلے جو منصوبہ بنایا جائے گا، وہی خاکہ کہلائے گا۔

2.4.1 : خاکہ کی اہمیت وافادیت

موضوعِ تحقیق کی تکمیل کا ابتدائی مراحل خاکہ کی تیاری ہے۔یہ بے حد اہم مرحلہ ہوتا ہے۔اس میں پورے تحقیقی

منصوبے کی تفصیلات کو درج کیا جاتا ہے۔ اس کی حیثیت تحقیقی منصوبے میں مرکزی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی عمارت کے نقشے کی ہوتی ہے۔ اگر اس کی تعمیر سے پہلے نقشے کو تیار نہ کرایا جائے تو اس کی ساخت میں بہت سے نقائص رہ جانے کا امکان ہوتا ہے۔ مثلاً عملی لحاظ سے ناکارہ ثابت ہونے کا خطرہ ہوسکتا ہے۔ اس کا جمالیاتی پہلو بری طرح متاثر ہونے کا امکان بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر محقق تحقیقی منصوبے کا خاکہ پہلے سے تیار نہیں کرتا، تو ممکن ہے کہ اس کے کام میں بہت سی خامیاں رہ جائیں یا اس کو بہت سی مشکلات سے دوچار ہونا پڑے۔ وہ محقق جو کسی تحقیقی صورت حال کے مسائل اور مشکلات پر محتاط طریقے سے غور وفکر نہیں کرتا وہ نہ تو موزوں فرضیات بنا سکتا ہے اور نہ ہی معلومات کی جمع آوری کے لیے موثر طریقہ اختیار کرسکتا ہے۔

مجوزہ موضوع کا خاکہ تحقیقی کام کو آگے بڑھانے میں بڑا معاون ومددگار ثابت ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ اسکالر اپنے تحقیقی کام کا تجزیاتی جائزہ بھی لے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ نگراں اور اسکالر دونوں کے درمیان موضوع کی نوعیت کے متعلق واضح تصورات ہوتے ہیں۔ خاکہ کی تیاری سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ تحقیقی کام کے عمل میں بڑی تیزی کے ساتھ رہنمائی ملتی ہیں۔ اور خاکہ کی تیاری کے توسط سے اسکالر کا ذہن مقالے کی ہیئت Form متعین ہوجاتی ہے۔

2.4.2 : خاکہ کی تیاری کے عناصر

کسی بھی موضوعِ تحقیق کے خاکہ کو تیار کرنے کے لیے ذیل کے عناصر کو مدنظر رکھنا لازم ہے:

(ا) صفحہ عنوان:

اس صفحہ عنوان پر مندرجہ ذیل معلومات ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) عنوان تحقیق:

(۲) اس کے نیچے (علمی درجہ کا نام جس کے لیے خاکہ پیش کیا جارہا ہے مثلاً خاکہ تحقیق برائے ایم۔فل پی ایچ ڈی وغیرہ۔)

(۳) یونیورسٹی کا مونوگرام

(۴) دائیں جانب ''مقالہ نگار'' لکھ کر اس کے نیچے محقق کا نام اور رول نمبر وغیرہ۔

(۵) اس کے بالمقابل ''زیرنگرانی'' لکھ کر اس کے نیچے نگراں استاد کا نام، علمی عہدہ اور پتہ وغیرہ۔

(۶) ڈیپارٹمنٹ کا نام مثلاً ''شعبہءاردو زبان وادب''

(۷) اس کے نیچے یونیورسٹی کا نام،شہراور ملک کا نام مثلاً بمبئی یونیورسٹی،بمبئی،انڈیا۔

(۸) سب سے آخر میں تعلیمی سال لکھا جائے گا۔مثلاً تعلیمی سیشن ۲۰۱۹ء

(۲)مقدمہ:

صفحہ عنوان کے بعد اگلے صفحہ پر مقدمہ کی ہیڈنگ تحریر کی جاتی ہے۔ یہ مقدمہ مقالے کا مقدمہ نہیں بلکہ خاکہ ''محقق'' کا مقدمہ ہے۔جس میں محقق اپنے موضوع اور عنوان کے حوالے سے مندرجہ ذیل اہم امور کے بارے میں جامع انداز میں معلومات فراہم کرتا ہے۔

(الف) : تعارف موضوع:

محقق مختصر الفاظ میں اپنے موضوع کا تعارف پیش کرتا ہے اور خاص طور پر فرضیہ تحقیق کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

(ب) : فرضیہ تحقیق:

فرضیہ تحقیق کی تعریف یوں ہے کہ محقق اپنے تحقیقی کام کو ابتدا کرنے سے قبل کسی مسئلے کے متعلق کوئی رائے، اندازہ، دانشورانہ قیاس ہے۔ جسے وہ موضوع کے انتخاب کے بعد وقتی طور پر اختیار کرتا ہے۔خواہ تحقیق کے بعد وہ فرضیہ غلط ہی ثابت کیوں نہ ہو جائے۔فرضیہ ایک طرح سے اسکالر کی پیشگوئی ہوتی ہے۔ جو قبل از مطالعہ مصادر و مراجع کی جاتی ہے۔ جو تحقیقی موضوع یا مسئلہ کے حل کے سوالات سے عبارت ہوتا ہے۔ دراصل فرضیہ میں ان امکانی جوابات کی پیشگوئی ہوتی ہے گویا موضوع یا مسئلہ سے اُٹھنے والے اہم سوالات کے متوقع اور امکانی جوابات ہی فرضیہ کہلاتے ہیں۔ اس مرحلے میں محقق ہمیشہ اپنے مطلوبہ مواد کی تلاش میں فرضیہ کا سہارا لیتا ہے تا کہ اس کی تصدیق یا تردید ہو جائے۔اس فرضیہ کی بدولت اسکالر اپنے موضوع تحقیق کے خاص پہلوؤں پر بھی سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کرتا ہے۔ پروفیسر خالق داد ملک نے اپنی تصنیف تحقیق و تدوین میں فرضیہ کے متعلق لکھا ہے کہ فرضیہ تحقیق تمام لٹریچر کا طائرانہ جائزہ لینے کے بعد لکھنا چاہیے اور فرضیات لکھنے کا انداز بیانیہ ہونا چاہیے نہ کہ سوالیہ۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر قسم کی تحقیق میں فرضیہ کی ضرورت ہو۔ اگر محقق صرف معلومات وحقائق کو جمع کر رہا ہو مثلاً کسی مکتبہ کے مخطوطات کی فہرست تیار کر رہا ہو یا کسی موضوع پر کتابیات مرتب کر رہا ہو، کوئی اشاریہ بنا رہا ہو یا اس قسم کی کوئی فہرست بنا رہا ہو تو کسی فرضیے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن وہ تحقیق جو

تنقیدی تشریح وتوضیح کا کام کرتی ہے اس میں فرضیہ ضروری خیال کیا جاتا ہے۔یعنی فرضیہ وہ روشنی کی کرن ہے جس کی رہنمائی میں محقق اپنے نظریات وخیالات وتصورات کے ثبوت کو تلاش کرتا ہے۔

(ج) : مقاصد تحقیق:

اس مقدمہ میں تحقیق کے بنیادی مقاصد اور اہداف کے نکات کو بیان کیا جاتا ہے: مثلاً

(i) اسباب انتخاب موضوع: مقدمہ میں موضوع تحقیق کے انتخاب کرنے کی وجوہات اور اسباب کو بیان کیا جاتا ہے۔

(ii) سابقہ تحقیقات کا جائزہ: خاکہ میں اس موضوع کا مختصر جائزہ لیا جاتا ہے۔مثلاً کہ یہ مسئلہ (موضوع) کب شروع ہوا؟ اس کا ارتقاء کیسے ہوا؟ کس کس پہلو سے اس پر تحقیق ہوئی؟ کن لوگوں نے اس پر تحقیق کی؟ اور ان محققین نے کس حد تک تحقیق کی؟ پھر وہ کونسا نکتہ ہے جہاں اس نئی تحقیق کا آغاز کیا جارہا ہے؟ اس قسم کے سوالات کا جواب خاکہ کے اس حصہ میں تحریر کیا جاتا ہے۔

(۳) اہمیت موضوع:

خاکہ کے مقدمہ میں موضوع کی اہمیت کا تذکرہ کیا جاتا ہے، اور تحقیق کی اہمیت کے حوالے سے ان تمام استفسارات کا جواب دیا جاتا ہے۔

(۴) منہج تحقیق:

خاکہ تحقیق کے مقدمہ میں اسکالر اپنے موضوع کی مناسبت سے منہج تحقیق کی وضاحت کرتا ہے۔اس نکات میں محقق اپنے نظریاتی علوم کو مع منہج عقلی، منطقی، استقرائی، وصفی، تحلیلی، استدلالی اور استنباطی انداز سے پیش کرتا ہے۔اس کے علاوہ تحقیق کے تمام مراحل، طرف، اسالیت معنویہ ومادیہ اور وسائل کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۵) محنت وکاوش اور وسائل تحقیق:

خاکہ تحقیق کے مقدمے میں محقق یہ بھی وضاحت کرسکتا ہے کہ اسے اس موضوعِ تحقیق میں کتنی ذہنی، جسمانی، اور مادی محنت کی ضرورت پڑے گی، اور کون کون سے وسائل کا استعمال کیا جائے گا۔ان نکات کے ذریعہ محقق اپنی محنت کا تذکرہ کر کے موضوعِ تحقیق کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔

(٦) بنیادی مصادر و مراجع:

مقدمہ میں محقق اپنے موضوع کے متعلق بنیادی مصادر و مراجع کا تعارف بیان کرتا ہے کہ موضوع تحقیق کے مواد کے اصلی مصادر یعنی Primary Tertiary وغیرہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(iii) آلات کا استعمال:

(iv) ابواب و فصول اور ان کے عنوانات

یہ خاکہ کا اہم حصہ ہوتا ہے اس حصے میں محقق اپنے تحقیقی کام کے اسلوب کو تقسیم کرتا ہے۔ تحقیق کے طریقہ کار کے مطابق سناپسس میں موضوع کی تقسیم کچھ اس طرح کی جاتی ہیں:

(الف) ابواب

(ب) فصول

(ج) مباحث

(د) مطالب

(و) فروع

موضوع مقالے کو صرف ابواب میں تقسیم کرنا درست نہیں ہے۔ بلکہ ہر باب اور ہر فصل کا عنوان دینا بھی ضروری ہے۔ آج کل تمام یونیورسٹیوں میں ایم فل، اور پی ایچ ڈی کے اسکالر کے کورس ورک میں ان نکات کو تفصیل کے ساتھ سمجھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس حصے میں خلاصہ تحقیق، نتائج تحقیق، تجاویز، سفارشات، اور فہارس فنیہ کے عنوانات بھی دیے جاسکتے ہیں۔

(iv) مجوزہ مصادر و مراجع کی فہرست:

خاکہ کے مقدمہ کے آخری حصے میں موضوع عنوان کے تحت تمام اہم مصادر و مراجع کی فہارس درج کی جاتی ہے۔ اس فہرست کے مطابق حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کرنا چاہیے۔ مثلاً کتاب کا پورا نام، مولف کا پورا نام، ایڈیشن، مطبع، شہر، ملک اور سن طباعت وغیرہ کی تفصیلات درج کی جاتی ہیں۔

(i) زیر غور مسئلے سے متعلق رپورٹ کیے ہوئے مسائل جن پر پہلے ہی تحقیق ہو چکی ہے۔

(ii) ایسی رپورٹوں میں مطالعے کا خاکہ جس میں استعمال کیے ہوئے طریقے اور معلومات کی جمع آوری کے لیے استعمال کیے ہوئے آلات شامل ہوئے ہیں۔

(iii) مختلف قسم کی آبادی جس کا مطالعہ کیا گیا۔

(iv) وہ متغیرات جو مطالعے پر اثر انداز ہو سکتے تھے۔

(v) وہ غلطیاں یا خامیاں جو ظاہر ہوئیں۔

(vi) مزید تحقیق کے لیے سفارشات۔

معلومات کی جمع آوری کے لیے محقق جن آلات کو استعمال کرے گا، ان کو بیان کر دے مثلاً سوالنامہ، انٹرویو وغیرہ۔ ان کی موزونیت کے حق میں دلائل دے۔ یہ بھی بتائے کہ ان کے استعمال سے بیان کیے ہوئے مفروضات کے تقاضے پورے ہوں گے اور ان آلات کے استعمال سے جمع شدہ معلومات معقولیت اور اعتبار صفات رکھیں گی۔

2.5 : خلاصہ

تحقیق کے مدارج میں سب سے پہلی سیڑھی موضوع کا انتخاب ہے۔ اس مرحلے میں اسکالر کی تحقیقی شعور، علمی و ادبی ذوق وشوق، پسند و ناپسند کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ گویا موضوع کا انتخاب محقق اپنے تحقیقی لیاقت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ موضوع کے متعلق اسکالر کا ذہن صاف اور سنجیدہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ اسکالر اپنے مطالعہ کی روشنی میں موضوع کا انتخاب کرتا ہے۔ اس سلسلے میں محقق کو چند اہم ضروری نکات کو مدنظر رکھنا بے حد لازم ہے۔

(۱) محقق اچھی طرح تحقیق کر لے کہ موضوع کے مواد پر وافر مقدار ہے یا نہیں؟

(۲) موضوع ہمیشہ نیا اور اچھوتا ہو۔ تا کہ معاشرتی مقبولیت کا شرف حاصل کرے۔

(۳) محقق کا ذہن اپنے موضوع کے متعلق غیر جانب دار نہ ہو۔

(۴) پہلے سے تحقیق شدہ موضوع کے انتخاب سے گریز کیا جائیں۔

(۵) ایسے موضوع کا انتخاب کیا جائیں جس سے بنیادی احساس مجروح نہ ہو۔

اس کے علاوہ انتخابِ موضوع کے طریقہ کار کا بھی خیال رکھا جائیں۔ یعنی محقق اپنے تحقیق کے موضوع کے انتخاب کے دوران دو طریقہ کار کو اپنا سکتا ہیں مثلاً:

(الف) محقق کی طرف سے موضوع کا انتخاب

(ب) نگراں استاد کی طرف سے انتخابِ موضوع۔

مذکورہ نکات کی روشنی میں با آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ موضوع کے انتخاب میں اسکالر اپنے ذاتی پسند اور مطالعہ کے ذریعہ سے انتخاب کرسکتا ہیں۔ دوسرا نگراں استاد سے رائے مشورہ کے ذریعہ بھی انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ موضوع کے انتخاب کئی وسائل اور ذرائع سے بھی ہوتے ہیں جنکے ذریعہ سے بھی موضوع کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ذاتی معلومات و تجربہ، دوسروں سے گفتگو، غور وفکر اور سوچ بچار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی خبریں، اخبارات و مجلّات، محاضرات و دروس۔ وغیرہ۔ چونکہ موضوع کا انتخاب تحقیق کی سب سے اہم منزل ہے اس لیے محقق اچھے موضوع کا انتخاب کرے۔ اس کے لیے چند شرائط کو مدنظر رکھے۔ مثلاً جدت تخلیق، دلچسپی و رغبت، جامعیت اور وضاحت، لفظی تحدید، مصادر و مراجع کی دستیابی، مدت تحقیق کا لحاظ، مقالے کی طوالت، معاشرتی مقبولیت، اخراجات وغیرہ۔ مختصراً کہا جائے کہ موضوع کے انتخاب میں محقق مذکورہ بالا تمام نکات کا خاص خیال رکھے تاکہ محقق اپنے تکمیلی مرحلہ کو بہ آسانی سے پہنچے۔

تحقیق کی راہیں بڑی پیچیدہ اور مشکل کن ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ ایک تمناہی مسائل کا سلسلہ ہوتا ہے۔ اس سلسلوں کو کس طرح قابو رکھا جائے۔ یعنی تحقیق کو کس طرح گرفت میں رکھا جائے اس کے لیے ریسرچ کی ابتدا کرنے سے قبل خاکہ بنانا لازم ہے۔ خاکہ تحقیقی کام کا آغاز نقط ہوتا ہے۔ خاکہ کے لیے عربی میں ''خطۃ'' انگریزی زبان میں outline اور فارسی میں ''طرح'' کے کلمات مستعمل ہیں۔ تحقیق چونکہ باضابطہ اور مسلسل عمل ہے اس مرحلے میں محقق کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا امتحان ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسکالر اپنے تحقیقی کام کے لیے علمی منہج و طریقہ کار کو اختیار کرتا ہے تاکہ موضوعِ تحقیق کو عملی جامہ پہناتے وقت کوئی نقص نہ رہے۔ لہٰذا محقق خاکہ، نقشہ یا لائحہ عمل تیار کرتے ہیں۔ جس کے مطابق اپنے اس علمی و تحقیقی کام کو مکمل کر پاتا ہے۔ ذیل میں خاکہ کے مفہوم کو چند جملوں میں سمیٹا گیا ہے۔

(الف) وہ بنیادی و اساسی خطوط ہیں جن کے مطابق محقق دوران تحقیق اپنا کام کرتا ہے۔

(ب) تحقیق کے لیے کسی منتخب شدہ عنوان تحقیق کو مختلف ابواب، فعول اور مباحث میں تقسیم کرنا اور اسی طرح مناہج تحقیق، مقاصد تحقیق اور اسباب تحقیق ذکر کرنے کو خاکہ تحقیق کہا جاتا ہے۔

(ج) خاکہ مقالہ کی اس ابتدائی اور چھوٹی سی ہیئت وصورت کا نام ہے جو مقالہ مکمل ہونے کے بعد ہوگی۔

خاکہ کی اہمیت و افادیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس میں پورے تحقیقی منصوبے کا پلان ہوتا ہے۔ خاکہ کی اہمیت کا اندازہ ذیل کے نکات میں قلم بند کیا گیا ہے:

(i) خاکہ سے مقالہ کی ہیئت معلوم ہوتی ہے۔

(ii) مناسب لائحہ عمل اور منصوبہ بندی تیار ہو جاتی ہے۔

(iii) مختلف مشکلات اور تحقیقی عمل کی خامیوں سے بچا جا سکتا ہے۔

(iv) تحقیقی کام کی مختلف جزئیات پر آسانی سے غور کیا جا سکتا ہے۔

(v) خاکہ کی تیاری سے طے شدہ منہج ہی اختیار کرنا پڑتا ہے۔جس سے افراط وتفریط سے بچا جا سکتا ہے۔

(vi) خاکہ کی تیاری سے جانچ پرکھ، آسان ہو جاتی ہے اور رہنمائی میں آسانی ہوتی ہے۔

کسی بھی موضوعِ تحقیق کا خاکہ تیار کرتے وقت چند عناصر کو مدنظر رکھنا لازم ہے۔ کیونکہ اس خاکہ کی بنیاد پر پورے مقالہ (تھیسس) کو صفحہ قرطاس پر لانے کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔لہٰذا خاکہ تحقیق کے بنیادی عناصر کچھ اس طرح ہے:

(i) صفحہ عنوان

(ii) مقدمہ

اس حصے میں محقق اپنے تحقیقی کام کے مقاصد، اسباب، فرضیہ، منہج تحقیق، طریقہ کار، بنیادی ماخذ وغیرہ پر گفتگو کرتا ہے۔

(iii) ابواب وفعول کی تفصیل

(iv) مجوزہ مصادر ومراجع کی فہرست

2.6 : نمونے کے امتحانی سوالات

۱) انتخاب موضوع کا مفہوم بیان کیجیے۔

۲) انتخاب موضوع کے کیا طریقہ کار ہیں؟

۳) انتخاب موضوع کے کیا ذرائع ہیں؟

۴) تحقیقی مقالہ کے حوالہ سے خاکہ کی تعریف متعین کیجیے۔

۵) خاکہ بنانے کی کیوں ضرورت پڑتی ہے جائزہ لیجیے۔

۶) خاکہ کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالیے۔

۷) خاکہ بنانا ایک عمل ہے۔اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

۸) خاکہ کی تیاری میں بنیادی عناصر کا جائزہ لیجیے۔

۹) خاکہ تحقیق اور ماہر اساتذہ کمیٹی کی کیا اہمیت ہے۔اس پر روشنی ڈالیے۔

2.7 : فرہنگ

الفاظ		معنی
مدارج	:	درجے، رتبے
ذرائع	:	راستے، وسائل
وسائل	:	وسیلے ، واسطے
اشاعت	:	شائع کرنا، پھیلانا
مفاد	:	فائدہ کی جگہ
رغبت	:	خواہش، آرزو
میلان	:	توجہ
سماعت	:	سننے کی طاقت
خار	:	رشک، جلن ، کانٹا
خاکہ	:	وہ نقشہ جو صرف حدود کی لکیریں کھینچ کر بنایا جائے

2.8 : سفارش کردہ کتابیں

۱۔	تحقیق کا فن	ڈاکٹر گیان چند
۲۔	اردو میں تحقیق کے مسائل	ڈاکٹر حامید حسین
۳۔	اصول تحقیق و ترتیب متن	ڈاکٹر تنویر احمد علوی
۴۔	تحقیق کے طریقہ کار	ڈاکٹر ش: اختر
۵۔	تحقیق روایت تدوین	رشید حسن خان
۶۔	تحقیق سے تدوین کے اصول اور طریقہ کار	ڈاکٹر بلقیس بیگم

باب : سوم

مواد کی فراہمی

3.0 اجزاء

3.1 مقاصد
3.2 تمہید
3.3 موضوعات
3.3.1 مواد کی تعریف
3.3.2 مصدر و مرجع کا مفہوم اور اہمیت
3.3.3 مواد کی اقسام
3.3.4 موادِ تحقیق کے حصول کے وسائل
3.3.5 موادِ وصول کے طریقہ کار
3.3.6 مواد کی تنظیم اور و ترتیب کے اصول
3.4 خلاصہ
3.5 نمونے کے امتحانی سوالات
3.6 فرہنگ
3.7 سفارش کردہ کتابیں

3.1 : مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلباء سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ۔۔۔

☆ تحقیقی عمل میں مواد کی تعریف بیان کر سکیں گے۔

☆ مصادر و مراجع کے کے معنی و مفہوم واضح کر سکیں گے۔

☆ مصادر و مراجع کی اہمیت بیان کر سکیں گے۔

☆ مواد کے اقسام واضح کرسکیں گے۔

☆ مواد کے حصول کے طریقہ کار اور وسائل سے واقف ہوسکیں گے۔

☆ مواد کی جمع آواری کے طریقہ کار اور اصول وضوابط بیان کرسکیں گے۔

3.2 : تمہید

محقق کی سب سے اہم منزل Data جمع کرنے کی ہوتی ہے۔ محقق اپنے موضوعِ تحقیق کے مطابق مطلوبہ مواد کو اکٹھا کرتا ہے۔ اسکالر کے ذہن میں مطلوبہ مواد کی تلاش اور اس کے ذرائع و وسائل کے متعلق واضح خاکہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ موضوعِ تحقیق کے کام کا اساسی عمارت معلومات مواد پر قائم ہوتا ہے۔ لہٰذا اسکالر اس مرحلے میں بڑی سنجیدگی اور لگن کا مظاہرہ کرے۔ اپنے مطلوبہ مواد کو حاصل کرنے کے لیے ان تمام ذرائع سے واقفیت کا ہونا ضروری ہے عموماً Data حاصل کرنے کے یہ اہم بڑے ذرائع ہیں۔ ایک لائبریری، دوسرا عوام کی دنیا۔ لائبریری علمی دنیا کی ایک ایسی بہترین جگہ ہے جہاں اسکالر سے لے کر عام قاری تک اپنی علمی تشنگی کو مٹا سکتے ہیں۔ کتب خانہ ریسرچ کرنے والوں کے لیے ایک نعمت خداوندی کا درجہ رکھتا ہے۔ کتب خانے میں بیشتر موضوعات یعنی سائنس، ادب سماجی علوم، معاشیات، سیات وغیرہ پر وافر مقدار میں معلومات ہوتی ہیں۔ محقق کو اپنے موضوعِ تحقیق کو حاصل کرنے کا یہ پہلا ذریعہ ہوتا ہے۔ جس کے توسط سے Data جمع کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے ذرائع معلومات حاصل کرنے کی عوام کی دنیا سمجھی جاتی ہے۔ اس ذرائع سے بعض واقعات اور روایت کی تصدیق ہوتی ہے۔ گویا معلومات Data کا ذخیرہ چاروں طرف بکھرا پڑا ہے۔ اسکالر اپنی بصیرت کے ذریعہ ان نادر و نایاب Data کو حاصل کرسکتے ہیں۔ موضوعِ تحقیق میں مواد کی اہمیت مسلم ہے۔ اس کے بغیر مقالہ کو قلم بند نہیں کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ تحقیق کے مطابق معلومات کو کئی خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے تاکہ محقق اپنے ریسرچ کے طریقۂ کار کے مطابق اپنی علمی تحقیق کے عمل کو سرانجام دیں۔ اس باب میں مواد کی جمع آوری اور اسے حاصل کرنے کے ذرائع کے متعلق تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

3.3 : موضوع کی وضاحت

3.3.1 : مواد کی تعریف

تحقیقی عمل میں تحقیق کا دارومدار مواد پر قائم ہوتا ہے۔ مواد محقق کے اندر غور و فکر اور وسیع مطالعہ کی دعوتِ فکر عطا

کرتا ہے۔خالص مواد کی شکل ان خام مال کی طرح ہوتی ہے۔اسی خام مال سے تجزیہ، درجہ بندی اور تحقیق کے نتائج اور عام اصول وضع ہوتے ہیں۔گویا مواد موضوعِ تحقیق کے لیے ایک ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہوتی ہیں۔جس کے ماتحت نئے افکارات، انداز فکر، نئے تصورات کو جنم دیتے ہیں اور تحقیق کے میدان کو وسعت عطا کرتے ہیں۔

3.3.2 : مصادر و مراجع کا مفہوم اور اہمیت

مصادر و مراجع سے مراد وہ کتابیں ہیں جن سے تحقیق کے لیے مواد لیا جاتا ہے۔بنیادی طور پر مصادر و مراجع میں دقیق فرق ہے۔مصادر مصدر کی جمع ہے۔جس کے معنی ہیں صادر ہونے کی جگہ یا نکلنے کی جگہ۔کسی موضوع پر بنیادی وا ساسی کتب کو مصادر کہتے ہیں۔یعنی وہ علوم ہے جو کسی علم کے بارے میں ایسے طریقے سے تحقیق کرتی ہو جس میں جامعیت وسعت اور ایسی گہرائی ہو جو اس کتاب کو ایسا اصلی ذریعہ بنادے کہ محقق اس علم کے بارے میں تحقیق کرنے کے لیے اس کتاب سے بے نیاز نہ ہو سکے۔دوسرے لفظوں میں کہا جائے کہ مصادر سے مراد کسی موضوع پر لکھی گئی قدیم کتابیں ہیں۔جن سے مواد لینے کے لیے محقق ان سے استفادہ کرتا ہے۔اس زمرے میں ،مخطوطات تاریخی دستاویز شامل ہیں۔

مراجع مرجع کی جمع ہے۔جس کے معنی ہیں رجوع کی جگہ۔اصطلاحی طور پر کسی موضوع پر ثانوی ماخذ کو مراجع کہتے ہیں۔یہ ایسی کتب ہوتی ہیں جو اپنے سے پہلی کتب کو بنیاد بنا کر لکھی گئی ہوں۔مراجع کو آسان لفظوں میں یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ جدید کتابیں جنہیں جدید یا ہم عصر مولفین نے کسی قدیم موضوع پر تحریر کیا ہو۔اس زمرے میں شرح و تحلیل، تنقید و تبصرہ، وغیرہ شامل ہیں۔

☆ مصادر و مراجع کی اہمیت

تحقیقی عمل میں مصادر و مراجع کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔خواہ بنیادی مصادر ہو یا ثانوی۔تحقیقی عمل میں ان دونوں وسائل کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ذیل میں مصادر و مراجع کی اہمیت کے نکات کو درج کیا گیا ہے۔

(۱) تحقیق کا سفر مصادر و مراجع کی روشنی میں طے پاتا ہے۔

(۲) مصادر کے بغیر حقائق منظرِ عام پر نہیں لائے جاسکتے۔

(۳) مآخذ کے بغیر مختلف روایات یا شخصیات میں تقابل ممکن نہیں۔

(۴) مآخذ کے بغیر علمی سرقہ کی نشاندہی ممکن نہیں۔

(۵) مصادر کے بغیر قدیم شخصیات یا موضوعات پر گفتگو ممکن نہیں۔

(۶) مصادر کے بغیر کسی بات کی توثیق یا تردید ممکن نہیں۔

(۷) مآخذ کے بغیر کسی قسم کی تحقیقی صلاحیتوں اور کارناموں پر روشنی نہیں ڈالی جاسکتی۔

(۸) منابع کے بغیر قدیم علمی ورثہ رسائی ممکن نہیں ہوسکتی۔

(۹) مآخذ کے بغیر مستند اور معروضی نوعیت کی حامل تحقیق ممکن نہیں۔

(۱۰) مآخذ ومنابع کے بغیر فہرست کتب، تصحیح وتدوین متن، حواشی وتعلیقات اور حوالے کا اندراج جیسے تحقیقی اقدام اُٹھانا ممکن نہیں۔

(۱۱) مصادر ومراجع کے بغیر قدیم علمی ورثہ سے استفادہ ممکن نہیں۔

3.3.3 : موادکی اقسام

ادبی مواد متعدد قسم کا ہوتا ہے۔ عموماً بنیادی طور پر دو اقسام پائے جاتے ہیں۔

(i) بنیادی مواد

(ii) ثانوی مواد

اس کے علاوہ داخلی اور خارجی مآخذ بھی ہوتے ہیں۔ مآخذ کے متعلق ڈاکٹر افتخار احمد خان اپنی تصنیف اصولِ تحقیق میں مانتے ہیں کہ:

''مصادر کی پہلی قسم کو تیار شدہ مواد کے مصادر کہتے ہیں جس میں کتابیں، انسائیکلو پیڈیاز، جبکہ دوسری قسم کو خود تیار کردہ مواد کے مصادر کہتے ہیں جس میں انٹرویوز، سوال نامے، مشاہدہ تجربہ اور آزمائش شامل ہیں۔''

مذکورہ آراء کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مواد کا تعلق بنیادی ہو یا ثانوی، داخلی ہو یا خارجی محقق اپنے مطلوبہ موضوع کا مآخذ ذیل کی فہرست کے ذریعہ حاصل کرسکتا ہے:

(i) مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتب

(ii) جرائد ورسائل، اخبارات اور تحقیقی مقالات

(iii) دستاویزات (ذاتی وسرکاری)

(iv) بصری مواد(فلم، ٹیلی ویژن،ٹیسٹ)

(v) مائیکروفلم

(vi) الواح

(vii) سمعی(ریڈیو،کیسیٹ،تقاریر،مباحثے)

(viii) ملاقاتیں،انٹرویوز

(ix) مراسلت کے ذریعے استفسار،سوال نامے

(x) مشاہدہ تجربہ اور آزمائش۔

3.3.4 : مواد تحقیق کے حصول کے وسائل

تحقیقی منصوبے سے متعلقہ مواد کی فراہمی یا اس کو حاصل کرنا محقق کے لیے سب سے بڑا دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے۔اس معلومات تک رسائی حاصل کرنا اسکالر کا نصب العین ہوتا ہے۔اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے محقق کو متعدد مشکلات اور رکاوٹوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔اس اہم منزل کو پانے کے لیے اسکالر کے ارادے اور حوصلے بلند ہونے چاہئیں تاکہ وہ اپنے مطلوبہ مواد کو حاصل کر پائے۔ذیل میں چند وسائل کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں سے مواد تحقیق حاصل کیا جاسکتا ہے۔

(۱) لائبریریاں:

لائبریری مواد کی فراہمی کا اہم ترین ذریعہ ہوتی ہے۔محقق اپنے موضوعِ تحقیق کے متعلق مواد کو لائبریری میں تلاش کرسکتا ہے۔اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ ایک ہی لائبریری میں موضوعِ تحقیق کے تمام مواد فراہم ہوجائیں۔ بعض چیزیں ملک کی مختلف لائبریریوں، ذاتی کتب خانوں،عجائب گھروں وغیرہ میں دستیاب ہوسکتی ہیں۔لہٰذا محقق ان تمام جگہوں پر اپنے مطلب کی مواد کو تلاش کرسکتا ہے۔اس کے علاوہ ذیل میں لائبریری سے استفادہ کرنے والے مواد کی دستیابی کی فہرست درج کی گئی ہے۔

(۱) دستاویزات

(۲) موضوع سے متعلق فاضلانہ مطالعہ

(۳) ایسی کتابیں یا مضامین جن میں موضوع سے متعلق اقوال یا نقطہ ہائے نظر پیش کیے گئے ہوں۔

(۴) دیگر قسم کا ملا جلا مواد۔

(۵) یونیورسٹیوں میں تحقیقی اسناد کے لیے پیش کیے جانے والے تحقیقی مقالات کی مصدقہ نقول۔

(۶) حوالے کی کتابیں، تحقیقی مقالات کے مختصر جائزے اور فہرست کتب

(۷) نایاب کتابوں کی فوٹو اسٹیٹ نقول۔

لائبریری ایک ایسی بہترین جگہ ہے جہاں صرف معلومات کا خزانہ ہوتا ہے۔ محقق لائبریری سے صرف کتابیں نہیں حاصل کرتا بلکہ دیگر سہولتیں بھی اسے ملتی ہیں۔ مثلاً مائیکرو فلم پڑھنے کی سہولت، فوٹو کاپی، ڈیجیٹل سہولت وغیرہ۔

(۲) تحقیقی رسائل:

تحقیقی رسالوں میں بھی تحقیقی مواد کا وافر مقدار پایا جاتا ہے۔ ان رسائل میں ماضی اور حال کے تحقیقی کاموں کی تفصیلات درج ہوتی ہیں۔ محقق اپنے موضوعِ تحقیق کا مواد ان ذرائع سے بھی حاصل کرسکتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے تحقیقی رسالوں کی اہمیت کو اس طرح بیان کیا ہے ''کتابوں کی طرح رسالے بھی تحقیق کا بیش بہا مواد فراہم کرتے ہیں بلکہ رسالوں کو ایک لحاظ سے فوقیت دیتے ہے کہ کتابوں کا مواد تو سب کے سامنے ہوتا ہے رسالوں بالخصوص قدیم رسالوں میں نہ جانے کیا کیا بیش بہا معلومات دفن پڑی ہیں۔''

لہٰذا اسکالر اس قیمتی (رسائل) ذرائع کو نظر انداز نہ کرے خاص طور سے قدیم رسالے کے خاص نمبرات بہت مفید ہوتے ہیں۔

(۴) اخبار:

اخباروں کی بنیادی مآخذ کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ محقق اپنے مطلوبہ مواد کی حصولیابی اخباروں کے ذریعہ حاصل کرسکتا ہیں۔ تحقیق میں اخبار معتبر مآخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۵) عوام:

حصول مواد کے ذرائع میں سے عوام سے حاصل شدہ معلومات بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ بعض اوقات واقعات اور روایات کی تصدیق صرف عوام کے ذریعہ ہوتی ہے۔ لہٰذا محقق اپنے موضوع تحقیق کے مطلوبہ مواد کی رسائی ان ذرائع

سے بھی کرسکتا ہے۔

3.3.5 : موادِ تحقیق کے حصول کے طریقہ کار:

حصول مواد کے مذکورہ بالا وسائل کے ساتھ ساتھ محقق کو با مقصد مواد حاصل کرنے کے لیے صحیح اور سائنسی طریقوں کو استعمال میں لانا چاہیے تا کہ تھوڑے وقت میں مطلوبہ مواد کی دستیابی ممکن ہو پائے۔فنِ تحقیق کے ماہرین نے حسب ذیل طریقوں کا ذکر کیا ہے۔

(۱) انٹرویو:

بعض اوقات محقق اپنے مطلوبہ مواد کو حاصل کرنے کے لیے انٹرویو کا سہارا لیتا ہے۔یعنی معلومات کو اکٹھا کرنے کے لیے انٹرویو کیا جاتا ہے۔بعض دفعہ یہ انٹرویو انفرادی ہوتا ہے یا اجتماعی بھی ہوتا ہے۔انٹرویو باقاعدہ اور منظّم انداز سے لیا جاتا ہے۔محقق انٹرویو لینے سے قبل سوالات (مطلوبہ موضوع) کی فہرست تیار کرلے تا کہ اسکالر اپنے مطلب کے مواد کو جلد سے جلد پورا کر سکے۔

(۲) سوال نامہ:

مواد و معلومات جمع کرنے کے لیے بعض اوقات محقق سوال نامہ کے طریقہء کار کو اپناتے ہیں۔سوال نامہ تیار کرنے کا طریقۂ کار یوں ہوتا ہے کہ محقق اپنی سہولت و آسانی کو مدنظر رکھ کر آزاد یا مقید سوال نامہ تیار کرتے ہیں۔اور مطلوبہ افراد کو تقسیم کیا جاتا ہے۔اس طرح سے معلومات و مواد کے جوابات اکٹھے ہو جاتے ہیں۔اس کے بعد پھر محقق اپنی تحقیقی و تنقیدی بصیرت اور غور و فکر کے ذریعہ تبصرہ و تنقید کرتا ہے۔

(۳) مشاہدہ:

مواد کی حصولیابی کے طریقۂ کار میں مشاہدہ کی اپنی ایک اہمیت ہے۔مشاہدہ عمل کے دوران محقق کی ساری توجہ صرف اپنے موضوع تحقیق پر مرکوز ہوتی ہے۔مشاہدہ کے متعلق پروفیسر ملک کا ماننا ہے محقق موضوع تحقیق سے متعلق اشیا اور افراد کے نمونہ جات کا بذات خود مشاہدہ کرتا ہے۔کبھی وہ سڑک پر ٹریفک کے گزرنے کا،کبھی کلاس روم میں طلبہ کی حرکات و سکنات کا،کبھی سڑک عبور کرتے ہوئے،لوگوں کے تصرفات،کبھی گفتگو کے دوران متکلم کے اشارات اور کبھی سلام کرنے کے مختلف طریقوں یا لوگوں کے مختلف اندازِ گفتگو کا مشاہدہ کرتا ہے۔چنانچہ بعض اوقات یہ مشاہدہ آزاد ہوتا

ہے۔جب محقق اس کے لیے کوئی پہلے سے خاکہ تیار نہیں کرتا اور بعض اوقات یہ مشاہدہ مفید ہوتا ہے۔جب محقق پہلے سے طے شدہ چند اہم ن کات کا مشاہدہ کرتا ہے جو موضوع کے ساتھ خاص ہوتے ہیں۔یعنی مشاہدہ معلومات یا موضوعِ مواد جمع کرنے کا سب سے بہترین مصدر ہے۔کیونکہ اس میں محقق بذات خود مشاہدہ کرتا ہے اور اپنی سمجھ بوجھ کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ کرتا ہے۔اس کے علاوہ اپنے تحقیقی مقالے میں اس کی تفسیر و وضاحت کرتا ہے۔

(۴) آزمائش:

آزمائش کے ذریعہ بھی مواد کی حصول یابی ہوتی ہے۔محقق اس مرحلے میں ایک testing تیار کرتا ہے۔جس سے نمونے کے افراد کو گزارا جاتا ہے۔اس عمل میں محقق کی صلاحیت اور مہارت کو پرکھا جاتا ہے۔اس مقصد کے لیے محقق دو طرح کی آزمائش سے گزرتا ہے۔جس میں ان کی سابقہ صلاحیت اور بعد میں حاصل ہونے والی صلاحیت کی آزمائش کی جاتی ہے پہلی قسم کی آزمائش کو قبلی آزمائش Entry Test اور دوسری قسم کی آزمائش کو تحصیلی Qualification Test کہتے ہیں۔

آزمائش کی تیاری کے وقت محقق اس بات کا خیال رکھے کہ سوالات کی تعداد اس قدر ہو کہ ان کی وجہ سے صلاحیت پرکھنے اور نتائج نکالنے میں دشواری نہ ہو نیز سوالات صداقت پر مبنی ہوں۔تمام سوالات واضح انداز میں ہوں۔آزمائش Testging کے طریقہ کار کو معیاری اور مضبوط، منظّم طریقہ پر کرے۔

(۵) تجربہ :

کسی بھی تحقیقی موضوع میں ''تجربہ'' کا عمل بڑی اہمیت رکھتا ہے۔خاص طور سے مواد کی حصولیابی میں۔تجربہ بہترین وسیلہ ہے۔عام طور پر تجربات دو قسم کے ہوتے ہیں۔(۱) مجموعہ ضابطہ (۲) مجموعہ تجربہ۔اس سلسلہ میں پروفیسر ملک کا ماننا ہے کہ محقق کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ دونوں مجموعے تمام عوامل میں ہم مثل اور باہمی تعلق کے حامل ہوں۔اور دونوں کا باہمی اختلاف صرف ایک عامل یعنی عامل تجربی میں محصور ہو۔مثال کے طور پر اگر ہم ''شہد کے انسانی زندگی پر اثرات'' کا تجربہ کرنا چاہیں تو ہمیں انسانوں کے دو مجموعوں پر تجربہ کرنا ہے اور یہ ضروری ہے کہ یہ دونوں مجموعے عمر، وزن، کام اور غذا میں کیفیت، کمیت اور نوعیت کے لحاظ سے برابر ہوں۔نیز ان کی غذا کھانے، کھیل کود، سونے اور آرام کرنے کے اوقات بھی یکساں ہوں۔عامل تجربی ہی صرف مختلف عامل ہوگا اور وہ ہے شہد۔مجموعہ ضابطہ کو غذا کے

دوران شہد نہیں دیا جائے گا۔ یہ تجربہ اور بقیہ تمام تجربات عمل تجربی کے علاوہ تمام عوامل کو الگ کر دینے کی اساس پر قائم ہوتے ہیں۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد ہر مجموعہ کی صحت کی حالت کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ دونوں مجموعوں کے افراد کے وزن اور انہیں لاحق ہونے والے امراض کو ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ پھر معلومات کا تجزیہ و تحلیل کر کے مناسب نتائج کا استنباط کیا جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ ایک تجربہ اپنی تکمیل کے لیے بہت سا وقت بلکہ کئی سال لے جاتا ہے۔ پھر جا کر دونوں مجموعوں کے درمیان فرق ظاہر و نمایاں ہوتا ہے۔ کیونکہ عامل تجربی چند دنوں، ہفتوں یا مہینوں میں واضح نہیں ہو پاتا۔ مذکورہ ذرائع یا طریقے کار کی مدد سے تحقیقِ موضوع سے متعلق مواد کا حصول ممکن ہے۔

3.3.6 : مواد کی تنظیم و ترتیب کے اصول

فن تحقیق کے ماہرین نے مواد کی تنظیم و ترتیب کے چند بنیادی اصول مرتب کیے ہیں۔ ذیل میں درج کیے گیے ہیں

(ا) تحریر کا آغاز عنوان سے کرنا:

جمع شدہ مواد کی تنظیم و ترتیب کا پہلا مرحلہ تحریر کا آغاز عنوان سے کیا جائے۔ یعنی مقالے کی تحریر کی ابتدا براہِ راست محقق اپنے موضوعِ تحقیق سے کرے۔ اس کی وجہ یہ مانی جاتی ہے کہ اس قسم کے طریقہ کو سائنسی طریقہ کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں محقق اس امر کا خاص خیال رکھے کہ طویل تمہید اور تبصروں سے پرہیز کرے۔ کیونکہ مواد کی تنظیم و ترتیب کے اسلوب کو نقصان پہنچتا ہے۔ کیونکہ مقالہ کی قدر و قیمت اس نکات پر نہیں جانچی جاتی ہے کہ اسکالر نے اپنے موضوعِ تحقیق کے بارے میں کتنا کہا ہے بلکہ یہ واضح کرنا ہے کہ اس نے کیا کہا ہے اور کس انداز سے تحریر کا آغاز کیا ہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالمجید خان عباسی اپنی تصنیف اصولِ تحقیق میں فرماتے ہیں کہ بعض محققین بظاہر خوبصورت لیکن موضوع سے غیر متعلقہ بیانات اور غیر ضروری معلومات مقالے میں شامل کر کے اس کا حجم تو بڑھا دیتے ہیں لیکن واضح طور پر کسی اہم نتیجے پر پہنچتے ہوئے معلوم نہیں ہوتے۔ اس لیے براہِ راست موضوع سے شروع کرنا مقالہ نگاری کا اہم اصول ہے۔ وہ مقالہ جس کی تیاری میں اس اصول کا لحاظ رکھا گیا ہو وہ معیاری کہلاتا ہے۔

(۲) نتائج اور تاثرات کو پیش کرنے کا اصول:

جمع شدہ مواد کو تنظیم و ترتیب کے دوران عمل میں اس نکتہ کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ یعنی تمام جمع شدہ معلومات کو مقالہ میں شامل کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ محقق اپنے بنیادی نظریے کو واضح انداز میں بیان کرے۔ نتائج اور تاثرات کو خلوص و اختصار کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اس کے علاوہ محقق اپنے مفروضات کی تائید میں سب ثبوت کو پیش کرے۔ نتیجہ مقالہ کی تسوید میں موضوعِ تحقیق میں غیر ضروری چیزوں سے مبرار ہے گی اور مقالہ اپنے کے اعتبار سے صحت مندر ہے گا۔

(۳) اُسلوب تحریر:

اسلوب تحریر سے مراد محقق کی علمی و ادبی صلاحیت اور اس کے شعور و ادراک کی عکاسی کرتا ہے۔ محقق کے ذہن میں موضوع تحقیق سے متعلق افکار جس قدر واضح وصاف ہونگے اس کی تسوید بھی اس قدر روشن ہوگی۔ موضوعِ تحقیق اور محقق کے مزاج کے مناسبت سے عموماً اسالیب مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن محقق اپنے تحقیق کے بنیادی مقاصد کو مدنظر رکھے۔

اسلوب تحریر کے سلسلے میں محقق اس حقیقت سے بہ خوبی آشنار ہے کہ ایک اہم اور عمدہ دلائل کو اگر دلکش انداز میں بیان کیا جائے تو سامعین و قارئین اس جانب متوجہ نہیں ہوتے ہیں بلکہ ایک عام سی بات کو جدت انداز میں پیش کیا جائے تو وہ توجہ کا مرکز بنتی ہے اور علم تحقیق میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں محقق کو خوب محنت سے کام کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ اسلوب تحریر میں محقق کی علمی و ادبی سنجیدگی دکھائی دیتی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر خالق ملک نے اسلوب تحریر کے متعلق فرمایا کہ اسلوب کی نمایاں اور روشن خوبی ''وضاحت'' ہے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں قوت و جمال کا اثر بھی ظاہر ہو۔ اور اس کی اصل قوت اس کے بیان کے روشن ہونے اور حجت و دلیل کے پختہ ہونے میں پنہاں ہے۔ جبکہ اس کا جمال اس کی عبارتوں کے آسان ہونے میں اور اس کے الفاظ کے انتخاب میں ذوق سلیم میں پنہاں ہوتا ہے۔ عمدہ تحریر کا ایک سنہری اصول یہ ہے کہ معلومات کے پیش کرنے کے لیے الفاظ کا استعمال عمدہ اور براہِ راست ہو علمی اسلوب کے اندر رہتے ہوئے تعبیر اور اظہار مافی الضمیر کو دلکش بنانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جملوں کو چھوٹا رکھا جائے اور ایک متنوع اسلوب اختیار کیا جائے۔ اس لئے کہ اگر جملوں کو ایک دوسرے کے مشابہ اور ایک ہی طرز میں مکرر انداز میں پیش کیا گیا تو کلام کی تاثیر ختم ہو جائے گی۔ اور اس کا حسن ماند پڑ جائے گا۔''

یعنی کامیاب تسوید مقالہ اس نکتہ پر منحصر ہے کہ محقق اپنے اسلوب میں تنوع پیدا کرے۔ الفاظ و معنی کی مناسبت

سے مقالہ عبارت کیا جائے۔گرچہ یہ کام مشکل ہے لیکن علمی تحریر کو دلکش اور عمدہ بنانے کے لیے محقق کو وسیع مطالعہ،لغوی و نحوی،حرفی اور مختلف موضوعات کی تحریروں کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

(۴) مقالے کی زبان:

جمع شدہ مواد کی تنظیم وترتیب میں زبان کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔محقق اس نکتہ کو ملحوظ رکھے کہ تحقیقی مقالے کی زبان عام فہم،سادہ اور دلکش ہو۔ثقیل گنجلک ،اور مشکل الفاظ وجملوں سے پرہیز کیا جائے۔اکٹھا معلومات یا مواد کو جس زبان سے ترتیب دیا جارہا ہے۔اسی زبان میں تحریر کیا جائے نہ کہ دوسری زبانوں کے الفاظ کا استعمال کیا جائے۔اگر دوسری زبان کے الفاظ کا استعمال ضروری ہوتا ہے تو ایسی صورت حال میں انھیں بریکٹ کے ذریعہ تحریر کیا جائے۔فن تحقیق کے ماہرین نے زبان کے متعلق چند بنیادی تجاویز پیش کی ہیں جو یوں ہیں:

(۱) مقالہ عام طور پر زمانہ ماضی یا ماضی قریب میں لکھا جائے۔

(۲) نتائج کا تذکرہ زمانہ حال میں کیا جاسکتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا تعلق آخر میں ایک مخصوص عنصر سے نہیں رہ جاتا۔ایک عام تخلیق کا ذکر دور حاضر کی مناسبت سے ہی کیا جانا چاہیے۔

(۳) ضمائر متکلم (میں،ہم ،میرا، ہمارا وغیرہ) کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ان کے استعمال سے مقالے کا اختیار ختم ہوجاتا ہے۔

(۴) صیغہ فاعل کا استعمال صیغہ مفعول کے مقابلے میں زیادہ ہونا چاہیے۔

(۵) گنتی کے اعداد سو تک ہوں تو ان کو حروف میں لکھا جانا چاہیے۔سو سے زائد گنتی کو اعداد میں لکھا جاسکتا ہے اس کے علاوہ اگر جملے کی ابتدا گنتی سے ہوتی ہے تو اس کو حروف میں ہی لکھنا چاہیے۔

(۶) زیادہ تر ایک ہی فعل کے ساتھ دو سے زائد مسلسل جملوں کا اختتام نہیں ہونا چاہیے۔

(۵) الفاظ کا استعمال:

جمع شدہ مواد کی تنظیم وترتیب کے وقت معیاری الفاظ کا استعمال ضروری ہے۔محقق اس نکتہ کا خاص خیال رکھے کہ جملے عام فہم،سادہ اور مناسب وموزوں الفاظ کا استعمال کرے۔طویل مرکب اور غیر مستعمل الفاظ سے عبارت میں بوجھل پن آجاتا ہے۔اور موضوعِ تحقیق کا مفہوم واضح نہیں ہوتا ہے۔اس سلسلے میں پروفیسر عبدالستار دلوی نے چند بنیادی

باتوں پر زور دیا ہے جو یوں ہے:

(۱) اگر ایک سے زائد اصطلاحی الفاظ کا استعمال ہو رہا ہو تو ان میں سے اسی لفظ کا انتخاب کرنا چاہیے جو زیادہ تر لوگوں کے لیے تسلیم شدہ ہو۔

(۲) مقالے کے شروع میں جن اصطلاحی الفاظ کا استعمال ہوا ہے اس مفہوم میں ان ہی الفاظ کا استعمال پورے مقالے میں کیا جانا چاہیے۔

(۳) اگر انگریزی یا کسی دوسری زبان کے اصطلاحی لفظ کا ترجمہ کیا گیا ہو تو بریکٹ میں یا تمہیدی حصے میں ان کی بنیادی شکل کا اظہار کر دینا مناسب ہوتا ہے۔

(۴) اگر اصطلاحی الفاظ کا استعمال کیے بغیر کسی خیال کا اظہار ممکن ہو تو اصطلاحی الفاظ سے احتراز کرنا ہی بہتر ہوگا۔

(۵) الفاظ کے استعمال کے بارے میں یہ مشورہ بھی دیا جاتا ہے کہ جدید انداز میں وضع کیے ہوئے الفاظ تخلیقی ادب میں چاہے کتنی ہی اہمیت رکھتے ہوں لیکن تحقیقی مقالے میں ان کا استعمال ایک نقص ہی سمجھا جائے گا۔ مقالے میں مقامی یا بازاری الفاظ کا استعمال بھی ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ ان کے استعمال سے زبان کی سنجیدگی ختم ہو جاتی ہے۔

3.4 : خلاصہ

کسی بھی موضوع تحقیق میں مواد کی حیثیت مرکزی ہوتی ہے۔ مواد کی بنیاد پر تحقیق کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ گویا مواد تحقیق کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا محقق اپنے متعلقہ موضوع کے لیے مواد کی حصول یابی اور اس کے طریقہ کار کے متعلق واقفیت ہونا لازم ہے۔

پورے تحقیقی عمل کا انحصار مواد پر ہوتا ہے۔ مواد کی حیثیت اس خام مال کی طرح ہوتی ہے لیکن محقق اپنی بصیرت اور تنقیدی صلاحیت کو بروئے کار لا کر حاصل شدہ معلومات Data سے بہتر نتائج اخذ کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مصادر و مراجع کے معنی و مفہوم اور اس کی اہمیت کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ مصادر سے مراد وہ کتابیں ہیں جس سے تحقیق کے لیے مواد حاصل کیا جاتا ہے۔ یعنی قدیم متون یا کتابیں۔ جبکہ مراجع کے معنی یہ ہے کہ قدیم کتابوں پر جدید مولفین اپنے خیالات و افکارات کا اظہار کرے۔ گویا پہلی قسم Original sources ہے اور دوسری قسم کو secondary sources کہا جاتا ہے۔ ان دونوں کی مدد سے تحقیق کے لیے معلومات اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔ بنیادی طور پر مواد دو قسم

کے ہوتے ہیں۔(ا) بنیادی دوسرا ثانوی مآخذ۔ان دونوں اقسام میں وہ تمام تحریریں مواد کے زمرے میں شامل ہیں جو مطبوعہ یا غیر مطبوعہ شکل میں ہوں۔محقق ان وسائل کو ذیل کے ذرائع سے حاصل کرسکتا ہے۔

(i) لائبریریاں
(ii) تحقیقی رسائل
(iii) اخبار
(iv) عوام

مواد کے حصولیابی کے متعدد طریقے کار ہوتے ہیں جنکی مدد سے محقق اپنے مطلوبہ مواد کو حاصل کرسکتا ہیں۔مثلاً انٹرویوز،سوال نامہ،مشاہدہ،آزمائش تجربہ وغیرہ ہیں۔ان تمام وسائل و ذرائع کو حاصل کرنے کے لیے مخصوص اصول و ضوابط کی ضرورت پڑتی ہے۔مواد کی جمع آوری میں محقق اس نکات کو ملحوظ رکھے تاکہ موضوعِ تحقیق کے تمام پہلوؤں پر غور وفکر کیا جاے.

3.5 : نمونے کے لیے امتحانی سوالات

۱) تحقیقی عمل میں مواد کی کیا اہمیت ہے؟اس پر روشنی ڈالیے۔
۲) مصادر ومراجع دونوں کے مفہوم میں کیا فرق ہیں؟ بیان کیجیے۔
۳) مواد کے کتنے اقسام ہیں،تفصیل سے روشنی ڈالیے۔
۴) موادِ تحقیق کے حصول یابی کے وسائل کا جائزہ لیجیے۔
۵) مواد کی جمع آوری میں کن اصول وضوابط کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے اس پر روشنی ڈالیں۔
۶) مواد کی تنظیم وترتیب میں کن شرائط کو ملحوظ رکھنا چاہیے؟ جائزہ لیجیے۔

3.6 : فرہنگ

الفاظ		معنی
شرح	:	تفسیر ،کھول کر کہنا
مصادر	:	نکلنے کی مقامات
مراجع	:	رجوع کرنے کی جگہ ، وہ لفظ جس کی طرف ضمیر پھرے

تردید	:	رد کرنا ، جواب دینا
دستاویزات	:	اہم کاغذات، وہ سند جس سے اپنا حق ثابت کر سکیں
ثانوی	:	دوسرے والا ، سکنڈری
منہج	:	نتیجہ دیا ہوا، نتیجہ
متعدد	:	گنے ہوئے،تھوڑے ، چند
مقالات	؛	مقالہ کی جمع، کہی ہوئی بات،قول تحریر
معتبر	:	جس پر اعتبار کیا جائے

3.7 : سفارش کردہ کتابیں

۱۔	تحقیق کے طریقہ کار	ڈاکٹر تبسم کاشمیری
۲۔	رہبرِ تحقیق	لکھنو یونیورسٹی
۳۔	تحقیق وتدوین	ڈاکٹر سید عبداللہ
۴۔	اردو میں اصول تحقیق	ڈاکٹر ایم۔سلطانہ
۵۔	اردو میں تحقیقی ڈائزین کا جائزہ	ڈاکٹر عطش درانی
۶۔	تحقیق سے تدوین کے اصول اور طریقہ کار	ڈاکٹر بلقیس بیگم

باب : چہارم

حوالہ اور حوالے دینے کے طریقہ کار

4.0 **اجزاء**

4.1 مقاصد

4.2 تمہید

4.3 موضوع کی وضاحت

4.3.1 حوالہ جات کی تعریف

4.3.2 حوالہ جات کی اقسام

4.3.2.1 حواشی کیا ہے؟

4.3.2.2 تعلیقات

4.3.3 : حوالے دینے کا طریقہ کار

4.3.4 : حوالہ دینے کے اصول

4.4 خلاصہ

4.5 نمونے کے امتحانی سوالات

4.6 فرہنگ

4.7 سفارش کردہ کتابیں

4.1 : مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ سے طلباء سے توقع کی جاتی ہے کہ۔۔۔

☆ حوالہ جات اور حوالہ جات کی تعریف بیان کرسکیں گے۔

☆ حوالہ جات کی اقسام بیان کرسکیں گے۔

☆ حواشی کے معنی مفہوم اور تعریف بیان کرسکیں گے۔

☆ حواشی لکھنے کی جگہ بتاسکیں گے۔

☆ حوالہ دینے کے اصول بیان کرسکیں گے۔

4.2 : تمہید

کسی بھی تحقیقی مقالے یا تحریر میں حوالہ جات کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں محقق کے علمی ذوق و مطالعہ کا ثبوت ملتا ہے۔ یعنی تحقیقی مقالہ میں دوسرے مصنفین کی کتابیں، تحقیقی مضامین، دستاویز وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ ان کاوشوں کا اعتراف کرنا محقق کا فریضہ ہے۔ حوالہ جات کی تعریف مختلف ماہرین علم نے اپنے منفرد لب ولہجہ میں کیا ہے۔ لیکن حوالہ جات کی بنیادی مفہوم میں مشترکہ آراء ملتی ہیں۔ کہ ترتیب متن میں حوالہ جات ایک نہایت لازمی جز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عام طور سے حوالہ جات کے تین اقسام نظر آتے ہیں:

(۱) حواشی

(۲) تعلیقات

(۳) اقتباسات

ان تینوں حوالہ جات کے اپنے اصول ومقاصد ہیں جن کی روشنی میں محقق اپنے تحقیقی متن کو مزین کرتا ہے۔ اس باب میں مذکورہ اقسام پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ حوالہ دینے کے طریقۂ کار بھی ہوتے ہیں کہ کس طرح سے محقق اپنے تحقیقی مقالہ میں حوالہ جات کا استعمال کرسکتا ہے۔ کون کون سے طریقہء کار کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ عام طور پر تین مروجہ طریقۂ کار ملتے ہیں ان طریقۂ کار کے مخصوص اصول ہوتے ہیں۔ لہٰذا حوالہ جات تحقیق کا ایک اہم شعبہ ہے جسے محقق کو اپنے تحقیقی مقالے میں ملحوظ رکھنا لازم ہے۔

4.3 : موضوع کی وضاحت

4.3.1 : حوالہ جات کی تعریف

کسی بھی تحقیقی منصوبے یا عمل میں محقق کی علمی وادبی افکار وخیالات کے شعور کی بھرپور عکاسی ملتی ہے لیکن اس تحقیقی عمل میں دوسروں کی تحقیقی کاوشیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ ان کاوشوں کا اعتراف ہم حوالہ جات کے نام سے کرتے ہیں۔ یعنی تحقیقی مقالہ میں دوسرے مصنفین کی کتابیں، تحقیقی مضامین، دستاویز وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ جو حوالہ جات کے

زمرے میں شامل ہوتے ہیں۔محقق کا بنیادی فریضہ ہونا چاہیے کہ ان تحقیقی کاوشوں کا اعتراف کرے۔اپنے تحقیقی مقالہ میں اہمیت دے،اس سلسلے میں کرنل غلام سرور لکھتے ہیں:

''علمی تحقیق کا بنیادی تقاضہ یہ ہے کہ جو کچھ ضبط تحریر میں لایا جائے یا جس بات کا زبانی اظہار کیا اس کی ٹھوس بنیاد موجود ہو اور اس کے ثبوت میں مستند حقائق اور شواہد فراہم کیے جائیں۔ایسا تحقیقی مقالہ جس میں دلائل کے ساتھ حوالہ جات نہ دئے گئے ہوں ہرگز ر معیاری قرار نہیں دیا جاسکتا، بلکہ اسے ایک فرد کے اپنے ذہن کی اختراع تصور کیا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اپنی تحقیقی کاوشوں کو وقیع بنانے کی غرض سے،محققین جدید کتب کا نوں کا سہارا لیتے ہیں اور کتب خانوں کے ماہر عملے کی ہدایات اور راہنمائی کی روشنی میں اپنی تحقیقی کاوشوں کو پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔''

[اصول تحقیق،ڈاکٹر عبدالمجید خان عباسی۔۲۷۷]

مذکورہ رائے اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ ترتیب متن یا مقالہ کے لیے حوالہ جات ایک نہایت اہم اور لازمی جز ہیں۔ان کے ذریعہ دوسروں کی کاوشوں کا اعتراف کرتے ہیں۔اس کے علاوہ محقق نے اپنے تحقیقی مقالہ میں جن مصادر کا استعمال کیا ہے اس کے ذرائع ووسائل کے مستند ہونے کا پتہ چلتا ہے۔یہاں تک کہ کوئی شخص اسی موضوع پر مزید تفصیل سے مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو ان حوالہ جات کے سہارے اپنے متعلقہ موضوع کے متعلق آسانی سے رسائی حاصل کرسکتا ہے۔

4.3. 2 حوالہ جات کے اقسام

کسی بھی تحقیقی مقالہ میں حوالہ دینے کا رواج نیا نہیں ہے۔عصر حاضر کے تحقیق کے مطابق اسے مقالہ کا اٹوٹ حصہ مانا گیا ہے۔جبکہ اسلامی علوم میں حوالہ جات کی کئی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔حوالہ جات کو چند اقسام میں بانٹا جاسکتا ہے۔درج ذیل میں اس کی درجہ بندی یوں ہے:

4.3.2.1 : حواشی کیا ہے؟

حواشی،حاشیہ کی جمع ہے۔یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔اس کے معنی ہر چیز کی طرفیں اور کنارے کے ہیں۔حواشی کی

تعریف کے سلسلہ میں ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں کہ پہلے زمانے میں کتابت وطباعت میں کچھ نثری عبارت یا اشعار درمیان میں لکھتے تھے اور کچھ اطراف کے حاشیے پر ترچھا کر کے۔اس نواحی جگہ کو حاشیہ کہتے ہیں۔ [ایضاً۱۹۹]

یعنی حاشیہ سے مراد وہ ثانوی افکار ہیں جسے محقق اپنے تحقیقی مقالہ میں پیش کرتا ہے۔اس کا مقصد مواد کی تشریح کرنا ہوتی ہے۔گویا کسی مخصوص نظریے یا سوچ کی وضاحت کرنے مع دلیل پیش کرنا ہے۔عصر حاضر میں حواشی کے معنی ''ہوامش'' کا نام دیا گیا ہے۔کیونکہ مقالہ کے ہر صفحے کے نیچے (دامن صفحہ میں) لکھا جاتا ہے۔اور اس کے مقابلے میں ''متن'' کا لفظ آتا ہے۔جسے محقق مقالے کے اوپر والے صفحے میں تحریر کرتا ہے اس طرح سے حوالہ جات کو ''باب'' کی شکل دے کر مقالے کے آخر پر درج کیا جاتا ہے۔جسے Endnots بھی کہا جاتا ہے۔حاشیہ کی تاریخ کے متعلق پروفیسر ڈاکٹر خالق دار ملک فرماتے ہیں کہ مہواش جمع ہے۔اور اس کا واحد ''ہاش'' آتا ہے۔اور بعض محققین اسے ''حاشیہ'' اور ''تعلیق'' کا نام بھی دیتے ہیں۔البتہ ان تینوں میں لغوی اور اصطلاحی فرق ضرور ہے۔قدیم دور میں حاشیہ متن کے چاروں اطراف میں لکھا جاتا تھا۔لیکن جب محققین نے موجودہ دور میں اسے صفحے کے نیچے (ذیل صفحے میں) لکھنا شروع کیا تو ان کے اس طریقے کو ہاش Footnote کا نام دیا گیا۔البتہ تعلیق سے مراد متن کے بارے میں وہ تبصرہ ہے جسے محقق حاشیہ یا ہامش میں نقل کرتا ہے۔مسلمان علماء میں آٹھویں صدی ہجری میں حواشی اور تعلیقات کا رواج پڑا۔انہوں نے اہم کتابوں پر حواشی اور تعلیقات لکھنا شروع کیں۔جن میں متن میں موجود تمام مشکل وپیچیدہ مقامات کی تشریح وتوضیح کیا جاتی تھی اور یہی چیز حاشیہ لکھنے کا سب سے بڑا اور اہم مقصد قرار پایا۔فقہ اسلامی میں مشہور ترتین حاشیہ ''حاشیہ ابن عابدین'' ہے۔یعنی حاشیہ نگاری کا فن زمانہ قدیم سے ملتا ہے۔اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ محقق حاشیہ نگاری کے ذریعہ اپنے مسودے پر نظر ثانی کرسکتا ہے۔اگر حاشیہ کا فن وجود میں نہیں آتا تو بہت سے افکار ادب ناواقف ہوتا۔لہٰذا محقق اپنے تحقیقی مقالہ میں حاشیہ نگاری کے فن کے تمام اصولوں کو ملحوظ رکھے کیونکہ تصنیف وتالیف کا ایک لازمی جز ہے۔

4.3.2.2 : تعلیقات کیا ہے؟

تعلیقات بھی حوالہ جات کے زمرے میں شامل ہے۔متن کی ترتیب میں تعلیقات بھی ایک لازمی جز ہے۔اس کی بھی اہمیت مسلم ہے۔تعلیقات کا بنیادی مقصد تشریحات وتصریحات ہے۔اگر چہ حواشی کے زمرے میں تعلیقات کی

اہمیت اجاگر ہوتی ہے لیکن تعلیقات کے بھی منفرد اہمیت وافادیت ہے۔ بقول ڈاکٹر عبدالمجید عباسی:

(۱) تعلیقات میں کسی مصنف کے نظریے یا تصور کو زیادہ تفصیل کے ساتھ جانا جاسکتا ہے۔ جو کہ اصل متن کے اندر ممکن نہیں ہوتا۔

(۲) تعلیقات میں کسی شخصیت، لفظ، اصطلاح، تلمیح، واقعہ اور مقام وغیرہ کے پس منظر اور پیش منظر کو جانا جاسکتا ہے جو اصل متن میں ممکن نہیں ہوتا۔

(۳) تعلیقات میں کی گئی تصریحات وتشریحات کی وجہ سے اس پر کسی کام کرنے والے محقق کا خاصہ وقت ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے۔ نیز اس کی تحقیق کے لیے ضروری مواد فراہم ہوتا ہے۔

(۴) تعلیقات کی وجہ سے کسی محقق کے لیے تحقیق کی خاطر کئی نئے موضوع اور مسائل کی نشان دہی ممکن ہو جاتی ہے۔

(۵) تعلیقات کی وجہ سے متن میں موجود ابہام کے کسی بھی پہلو کو زیادہ سے زیادہ کم کیا جاسکتا ہے یا مکمل طور پر ختم کیا جاسکتا ہے۔

(۶) تعلیقات میں متن کے مختلف مآخذ اور اختلافی قراردادتوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ جس سے تدوین میں آسانی رہتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اگر کسی محقق نے کسی مصنف کے متن کی تصحیح وترتیب کا کام کرنا ہو تو اس متن سے متعلق تعلیقات اس سلسلہ میں انتہائی سودمند ثابت ہوتی ہے۔

(۷) تعلیقات میں مصنف کی سوچ کی تصریح کے علاوہ دیگر ماہرین فن وادب کی آراء کی بھی اس میں جگہ دی گئی ہوتی ہے۔ جس سے قاری پورے خیال یا موضوع کو بھرپور جامعیت سے اپنی فکری گرفت میں لے سکتا ہے۔

(۸) تعلیقات کی وجہ سے اس ذیلی مواد کو سمجھنے میں آسانی رہتی ہے جسے بوجہ خطرہ طوالت متن میں درج نہیں کیا گیا ہوتا اور حواشی میں محض اس کا مختصر ترین تعارف ہی مل سکتا ہے۔

4.3.3 : حوالہ دینے کا طریقہ کار

عام طور پر حوالہ دینے کے تین طریقے کار ہیں۔ درج ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔

(الف) پہلا طریقۂ کار: اس طریقہ کار میں مصنف یا مرتب یا مدون، کے مشہور نام کو پہلے لکھا جاتا ہے۔ پھر کتاب کا نام، پھر ناشر، پھر سن اشاعت، پھر ایڈیشن (اگر ہے)، پھر جلد نمبر (اگر ہے) پھر صفحہ نمبر، مثلا:

فاروقی، شمس الرحمٰن، اردو افسانے کی حمایت میں، (ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی ۲۰۱۹) ص ۲۳۰۔

(ب) دوسرا طریقۂ کار:

اس طریقہ کے مطابق حوالہ کی ترتیب یوں ہے:

مصنف یا مرتب کا نام، کتاب کا نام، ایڈیشن (اگر ہے)، مقام اشاعت، ناشر، سال اشاعت، جلد (اگر ہے)، باب (اگر ہے) صفحہ یا صفحات مثلاً:

محمد حسین آزاد، آب حیات، طبع یازدہم (علی گڑھ ۱۹۱۱ء) ص ۱۰۱۔

(ج) تیسرا طریقہ کار:

حوالہ دینے کے تیسرے طریقہ کار کی ترتیب یوں ہے،

کتاب کا مکمل نام یا مشہور نام، (اگر ہو)۔ مؤلف کا پورا نام، مشہور نام جیسے ابن کثیر، ابن جریر، ایڈیشن (اگر ہو)، مقام اشاعت، ناشر، سال اشاعت، جلد (اگر ہو)، باب (اگر ہو) صفحہ یا صفحات مثلاً:

ڈرامہ نمبر، تزئین ادیب، ڈاکٹر ساجد علی قادری (چیف ایڈیٹر) شیر پور (مہاراشٹر)، ۲۰۱۹ء ص ۳۲۵۔

4.3.4 : حوالہ دینے کے اصول

ذیل میں حوالہ دینے کے اصول کی ترتیب یوں پیش کی گئی ہے۔ اگر فوراً اسی مصنف اور اسی کتاب کا حوالہ دینا ہو تو وہ یوں ہوگا۔

۱) ایضاً۔ یا نفس المصدر یا نفس المرجع، انگریزی میں سے "ibid" لکھا جائے گا۔

۲) اگر صفحہ کوئی اور ہو تو ایضاً وغیرہ کے بعد صفحہ لکھ دیا جائے۔

۳) اگر اسی کتاب کے کئی صفحات کا حوالہ دینا ہو تو انہیں یوں لکھا جائے۔ ص ۲۱ تا ۲۹۔

۴) اگر ایک صفحہ کے بعد کئی صفحات کا حوالہ دینا پڑ جائے تو یوں لکھا جائے، ص ۱۲ و بعد یا و مابعدھا، انگریزی میں اس "PP12FF" لکھا جاتا ہے۔

۵) اگر ایک صفحہ کے بعد مسلسل دوسرے صفحہ کا حوالہ بھی دینا ہو تو یوں لکھا جائے: ص ۱۹ تا ۲۰، یا ص ۱۹، ۲۰۔

۶) اگر کسی کتاب کا حوالہ نمبر ۹ بنتا ہے اور حوالہ نمبر ۱۱ بھی اسی سے ہو تو مؤلف کا مشہور نام، جو پہلی بار لکھا ہے، دوبارہ لکھائے، ساتھ محولہ بالا، یا المرجع اسابق لکھا جائے۔

اگر وہی مشہور نام کسی اور مؤلف کا بھی ہو تو ایسی صورت میں مشہور نام لکھ کر ساتھ کتاب کا نام ضرور لکھا جائے۔ کتب کے ناموں سے حوالہ دینے کی صورت میں کتاب کا نام دوبارہ لکھا جائے اور باقی معلومات میں اوپر والا اصول اپنایا جائے۔

۷) کسی کتاب کے مصنفین یا مولفین ایک سے زیادہ ہونے کی صورت میں درج ذیل اصول اپنائے جائیں۔

۸) اگر مصنف یا مولف دو ہوں تو دونوں کے مکمل نام کتاب پر مکتوب ترتیب کے مطابق لکھے جائیں۔ اگر کوئی مشہور نام ہے تو اسے پہلے لکھا جائے، پھر کتاب کا نام اور دیگر معلومات درج کی جائیں۔ مثلاً

فاروقی محمد احسن، نورالحسن نقوی، ناول کیا ہے (اردو کاڈرمی دہلی) ۱۹۷۵ء ص ۳۰ تا ۳۳۔

(ب) اگر مصنفین تین سے زیادہ ہو تو کتاب پر مکتوب پہلے مصنف کا نام لکھ کر وغیرہ اور دیگر حوالہ جاتی معلومات درج کی جائیں۔

۹) کسی کتاب کے مرتبین ایک سے زیادہ ہونے کی صورت میں درج ذیل طریقے اپنائے جائیں۔

(الف) اگر ایک مرتب ہو تو پہلے مرتب کا نام لکھ کر بریکٹ میں لفظ (مرتب) لکھ دیا جائے۔ تاکہ معلوم ہو کہ یہ مرتب ہے نہ کہ مصنف، پھر مرتب شدہ کا نام اور دیگر حوالہ جاتی معلومات درج کی جائیں۔

۱۰) رسائل و جرائد میں شائع شدہ مضامین کا حوالہ دیتے وقت میں یہ ترتیب اپنائی جائے، مضمون / مقالہ نگار کا نام، مقالے یا مضامین کا نام، رسالے یا جریدے کا نام، جریدے کی جلد اور نمبر شمار، سال اشاعت، مقام اشاعت، صفحہ نمبر۔

۱۱) کسی کمیشن یا کسی کمپنی کی جانب سے لکھی ہوئی کتاب کا حوالہ دیتے وقت اس کمیشن یا کمپنی کا نام دیا جائے پھر دیگر حوالہ جاتی معلومات درج کی جائیں۔

متعدد مولفین کے مجموعہ مقالات میں سے کسی مقالے کا حوالہ دینا ہوتو پہلے مقالہ نگار کا نام، پھر مقالہ کا نام پھر مجموعہ مقالات کا نام پھر ایڈیٹر کا نام پھر باقی کوائف بیان کیے جائیں۔

۱۳) مخطوطے کا حوالہ دیتے وقت پہلے مصنف کا نام پھر مخطوطے کا نام، پھر لائبریری کا نام (جہاں مخطوطہ ہے) پھر نمبر مخطوطہ اور اس کا صفحہ نمبر درج کیا جائے۔

۱۴) کسی کتاب کے ترجمے کا حوالہ دیتے وقت پہلے اصل کتاب کا نام پھر ترجمے کا نام (اگر ہو) پھر مترجم کا نام اور دیگر کوائف جیسے راغب الطباخ، ترجمہ بنام ''تاریخ افکار وعلوم''، مترجم افتخار احمد۔

۱۵) ریڈیو یا ٹیلی ویژن کے پروگرام کا حوالہ دیتے وقت پہلے موضوع پروگرام، پھر سٹیشن کا نام جہاں سے وہ پروگرام نشر ہوا ہے۔ پھر شہر کا نام جہاں وہ سٹیشن واقع ہے۔ پھر تاریخ اور وقت کا اندراج کیا جائے۔

[تحقیق کا فن، گیان چند جین، ۳۱۰]

4.4 : خلاصہ

حوالہ جات کا ان کوشوں کا اعتراف کا نام ہے۔ محقق اپنے تحقیقی مقالے میں دوسروں کی تحقیقی کاوشوں کو سراہا تا ہیں۔ یعنی محقق اپنے تحقیقی مقالے میں دوسرے مصنفین کی کتابیں، آراء، نظریے، خیالات وافکارات، مضامین وغیرہ کو شامل کرتے ہیں۔ عام طور سے حوالہ جات کی تین بڑی قسمیں ملتی ہیں۔

۱) حواشی

۲) تعلیقات

۳) اقتباسات

حواشی کے متعلق محققین کا فرمانا ہے کہ وہ ثانوی افکار ہیں۔ جسے محقق اپنے تحقیقی مقالے میں پیش کرتا ہے۔ اس کا مقصد مواد کی شرح کرنا ہوتا ہے۔ یعنی کسی مخصوص نظریے یا سوچ کی وضاحت کرنا ہے۔ موجودہ دور میں حواشی کو Foot Note کہا جاتا ہے۔ حواشی کا بنیادی مقصد متن میں مذکورہ افراد اور مقامات کا تعارف کرنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ محقق اپنے افکارات وخیالات کی تائید یا تردید میں دوسرے مصنفین کی آراء کو دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے اس فن کو لکھنے کے چند مخصوص طریقہ کار بھی ہیں۔ مثلاً صفحے کے دامن میں ہر باب کے اختتام پر، مقالہ کے اختتام پر ہیں۔ اب تک تحقیق کے مطابق حواشی کی پانچ قسمیں ہیں۔

۱) متنی
۲) تصنیفی
۳) غیر متنی
۴) ترتیبی
۵) توثیقی حواشی

حوالہ جات کی دوسری قسم تعلیقات ہے۔ تعلیقات سے مراد ہے کسی مصنف کے نظریے یا تصور کو زیادہ تفصیل کے ساتھ مطالقہ کیا جائے۔ حوالہ جات کے زمرے میں تعلیقات کو بھی منفرد حیثیت حاصل ہے۔

اقتباسات کے معنی مصنف کی اس عبارت یا تحریر کو محقق اپنے تحقیقی تحریر میں نقل کرتا ہے اس عمل میں محقق مصنف کی تحریر کو من وعن نقل کرتا ہے اپنی جانب سے کوئی ترمیم نہیں کرسکتا ہے۔ حوالہ جات میں اس فن کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ محقق اپنی دلیل کو مزید تقویت پہنچنے کے لیے اقتباس کا استعمال کرتے ہیں۔ اقتباس کے استعمال کرنے کا مخصوص طریقہ کار بھی ہوتا ہے۔ یعنی محقق اپنے تحقیقی مقالے میں حوالہ جات کو اس اندازہ سے تیار کرتا ہے کہ اس کے طریقہ کار کو مدنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اب تک تحقیق کے مطابق اس کے تین طریقہ کار ہیں۔ جس پر تفصیل سے گفتگو یونٹ کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ حوالہ دینے کے اصول بھی ہوتے ہیں۔ جس کی ترتیب کو محقق اپنے تحقیقی مقالہ میں تحریر کرتا ہے۔ مثلاً اگر فوراً اسی مصنف اور اسی کتاب کا حوالہ دیتا ہو تو ایضاً، کا استعمال کرتے ہیں انگریزی زبان میں ibid کا استعمال کرتے ہیں۔ مختصر حوالہ دینے کے طریقہ کار اور اصول کو مدنظر رکھ کر محقق اپنے تحقیقی مقالہ کو مزین کرسکتا ہیں۔

4.5 : نمونے کے لیے امتحانی سوالات

۱) حوالہ جات کی تعریف مع مثال پیش کیجیے۔
۲) حواشی سے کیا مراد ہے، اس کے مقاصد کو واضح کیجیے۔
۳) تعلیقات کیا ہے اس پر روشنی ڈالیے۔
۴) حوالہ دینے کا طریقہ کار، مقام متعین کیجیے۔
۵) حواشی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔
۶) حوالہ دینے کا طریقہ کار کا جائزہ لیجیے۔

۷) حوالہ دینے کے اصول پر روشنی ڈالیے۔

4.6 : فرہنگ

الفاظ		معنی
حواشی	:	حاشیہ کی جمع، کنارے، جو کتاب کے حاشیے پر لکھی جائیں
تعلیقات	:	ایک چیز کو دوسری چیز سے متعلق کرنا
اقتباس	:	چھانٹنا، اخذ کرنا، چنا ہوا کلام
اعتراف	:	اقرار کرنا ،تسلیم کرنا
اختراع	:	نئی بات نکالنا، ایجاد کرنا
ثانوی	:	دوسرے والا، منسوب
مآخذ	:	وہ جگہ جہاں سے کوئی چیز نکلے، اخذ کرنے یا لینے کی جگہ، اصل ، بنیاد
جز	؛	سوائے ،علاوہ
موازنہ	:	برابری ، اندازہ کرنا
ضائع	:	رائیگاں ،لاحاصل ،بے سود

4.7 : سفارش کردہ کتابیں

۱۔	تحقیق میں اشارہ سازی کی اہمیت	شاہدہ یوسف
۲۔	فن تدوین	ڈاکٹر جمیل جالبی
۳۔	تحقیق کے طریقہ کار	ڈاکٹر ش۔اختر
۴۔	اردو میں لسانی تحقیق	ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ
۵۔	تحقیق کا فن	ڈاکٹر گیان چند
۶۔	تحقیق سے تدوین کے اصول اور طریقہ کار	ڈاکٹر بلقیس بیگم

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆